137

مشاہداتِ حرم

سفرِ حج کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات

مولانا امین احسن اصلاحی

مُرتّب: مقبول الرحیم مفتی

دار التذکیر

○ اہتمام: محمد احسن تہامی

○ مطبع: اے این اے پرنٹرز ——— لاہور

○ تاریخِ اشاعت: 2000

○ قیمت: 90 روپے

دارُالتذکیر

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار،

لاہور۔ ۵۴۰۰۰ فون: ۷۲۳۱۱۱۹

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسافر اور سفرنامہ

اس سفرنامے کے مسافر ـــــــ مولانا امین احسن اصلاحی ـــــــ نے اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد میں شمولیت کے لیے فی الواقع ہجرت کی تھی۔ وہ اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی کی فکری میراث اور مدرسے دونوں کے 'امین' بنائے گئے تھے' لیکن جب اپنے دوست مولانا منظور احمد نعمانی کے ایما پر اُنھوں نے جماعت اسلامی میں شمولیت 'قبول' کر لی تو ان کے لیے زیادہ عرصے تک مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ا ضلع اعظم گڑھ (بھارت) میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا۔ اپنی اسلامی جماعت کے امیر' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پیہم اصرار پر ۱۹۴۴ء کے آغاز میں وہ اپنے وطن' اپنے مدرسے اور تفسیر قرآن کے علمی منصوبے کو خیرباد کہہ کر جماعت اسلامی کے مرکز 'دارالاسلام' پٹھان کوٹ ضلع گورداس پور (بھارت) میں آبسے۔ تقسیم ملک کے موقع پر جماعت اسلامی بھارت کے زعما کے اصرار کے باوجود اُنھوں نے وطن کی طرف مراجعت پر پاکستان کی طرف ہجرت کو ترجیح دی' کیونکہ جماعت اسلامی کا مرکز پٹھان کوٹ سے لاہور منتقل ہو گیا تھا' اور مولانا مودودی کے نائب کی حیثیت سے اُس وقت ان کا اِس مرکز سے وابستہ رہنا ہی قرین مصلحت نظر آتا تھا۔

لیکن پاکستان آنے کے بعد ابتدائی برسوں میں ہی جماعت کے ان دونوں قائدین ـــــــ مودودی و اصلاحی ـــــــ کے درمیان وہ فکری و ذہنی ہم آہنگی باقی نہ رہ سکی جو ایک امیر اور اس کے نائب کے درمیان لازماً ہونی چاہیے۔ آخر کار ۱۹۵۷ء میں جب مولانا مودودی نے اسلام کے اصول شورائیت کے برعکس' جماعت

کے دستور میں ترامیم کروا کے جماعت کو چلانے کی ساری ذمہ داریاں اور اختیارات' امیر کے منصب سے وابستہ کردیے اور شوریٰ کو بنیادی طور پر ایک پالیسی ساز ادارے کی حیثیت دے دی تو مولانا اصلاحی کے لیے جماعت میں رہنا ممکن نہ رہا۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت سے مستعفی ہونے کے بعد مولانا اصلاحی کو ایک بار پھر معنوی اعتبار سے ہجرت ہی کا مرحلہ درپیش تھا' کیونکہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا تانا بانا جس جماعت اور جس برادری کے اندر بنتا ہوا تھا اسے انھوں نے یک بارگی چھوڑ دیا تھا۔ اس فیصلے کے باعث ان کی طبیعت پر دل شکستگی اور مایوسی کی کیفیات کا طاری ہونا بالکل فطری بات تھی۔ پچاس پچپن برس کی عمر میں جبکہ انسان بالعموم عملی زندگی کی ذمہ داریوں سے فراغت کے مرحلے میں داخل ہو رہا ہوتا ہے' وہ ایک بار پھر' نئے سرے سے' ایک نئی دنیا آباد کرنے کی آزمائش اور ذمہ داری سے دوچار ہو گئے تھے۔

اس ہجرت ثانیہ کے آغاز میں مولانا اصلاحی کو فراغت کا جو مختصر وقفہ میسر آیا' اسے اُنھوں نے جوار بیت اللہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا' اس سفرنامے کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> .... میں ادھر کچھ عرصے سے اپنے گردوپیش سے کچھ ایسا دل شکستہ ہو رہا تھا کہ دل باربار یہ چاہتا تھا کہ اس ماحول کو چھوڑ کر کم از کم کچھ ہی دنوں کے لیے کہیں چلا جاؤں۔ اس مقصد کے لیے بہترین جگہ جس کا انتخاب میں کر سکتا تھا' وہ خدا کا گھر ہی ہو سکتی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کا سامان کر دیا' اور اپنی جس دیرینہ تمنا کے پوری ہونے کی توقع میں نہیں کرتا تھا وہ تمنا خدا نے پوری کر دی۔

مولانا اصلاحی نے اس سفرنامے میں چونکہ اپنی دل شکستگی کے اسباب کو بیان کرنے سے مکمل طور پر گریز کیا ہے' اس لیے ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ' واقعاتی تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے' ان کی گیرائی اور گہرائی کے پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے' تاکہ قاری کو 'مسافر' کی اس ذہنی کیفیت کا بھی کچھ اندازہ ہو' جس کے

ساتھ اس نے حج کے اس سفر کا ارادہ کیا تھا۔ مولانا اصلاحی نے سفرِ حج اور اس سفرنامے دونوں کو' جس طرح ان اختلافات اور ان سے وابستہ تکلیف دہ اور اذیت ناک کشمکش کے تذکرے سے آلودہ نہیں ہونے دیا' جن سے وہ جماعتی زندگی کے آخری ایام میں دوچار رہے تھے' ان کی عظمت کردار کی دلیل ہے۔ ایسی مثالیں اب ہمارے معاشرے میں شاذ ہی ملتی ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی جب یہ سفرنامہ لکھ رہے تھے تو اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ان کے ذہن میں تھا۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> میرا یہ سفرنامہ صرف مشاہدات' تجربات اور تاثرات پر مبنی ہے۔ میں نے اس میں حج کی دعائیں اور اس کے احکام نہیں دیے ہیں۔ جب اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کی نوبت آئے تو مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے میری درخواست ہے کہ وہ اس کے ساتھ امام ابن تیمیہ کے رسالہ 'مناسک الحج' کا ترجمہ یا اس کا خلاصہ بطور ضمیمہ شامل کر دیں تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے کار آمد ہو جائے جو سفرِ حج میں اس کو ساتھ رکھنا چاہیں۔ (میثاق۔ جون ۱۹۶۰ء۔ ص۔ ۳۱)

لیکن افسوس کہ مولانا اصلاحی کی زندگی میں ان کی خواہش کے مطابق سفرنامے کے کتابی صورت میں شائع ہونے کی نوبت نہ آ سکی۔ زندگی کی گوناگوں مشکلات اور آزمائشوں کے ساتھ مولانا تدبر قرآن لکھنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ کسی دوسری تحریر کو مرتب کرنے کی طرف شاید ان کا دھیان بھی نہیں گیا۔ اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف جو غالباً اپنے رسالے 'المنبر' کے ساتھ مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کا پروگرام بھی رکھتے تھے اپنے منصوبے کا آغاز ہی نہ کر سکے۔ یوں یہ سفرنامہ 'المنبر' اور 'میثاق' کے فائلوں میں ہی دفن ہو کر رہ گیا۔

تدبر قرآن کی تکمیل کے بعد مولانا اصلاحی کے شاگرد دان رشید نے اگرچہ ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں کو ان کی رہنمائی میں مرتب کر کے شائع کیا' لیکن اس سفرنامے کو شاید وقتی نوعیت کی تحریر سمجھ کر نظرانداز کر دیا گیا۔

راقم کو غالباً ۹۱۔۱۹۹۰ کے دوران میں، پہلے پہل اس سفرنامے کی قسطوں کو 'میثاق' کے متفرق شماروں میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ انھی دنوں برادرم احسن تمامی کو اس کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا لیکن میری تجویز سے اتفاق کرنے کے باوجود وہ اس ضمن میں کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔ اگر ہم اس وقت اس سفرنامے کی اشاعت میں کامیاب ہو جاتے تو یہ امر یقیناً مولانا اصلاحی کے لیے بھی حیرت انگیز مسرت کا باعث ہوتا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کو مولانا اصلاحی اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہمیں، ایک بار پھر، اس کی اشاعت کا خیال آیا، اور اس کی ان قسطوں کی تلاش شروع ہوئی جو 'میثاق' کے اجرا سے پہلے 'المنبر' میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کی دستیابی کے بعد اب یہ سفرنامہ مصنف کی قائم کردہ ترتیب کی مطابق کسی اضافے کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے۔

اس سفرنامے کی اشاعت کا مقصد محض ایک بڑے اور نامور مصنف کی بظاہر ایک غیراہم تحریر کو محفوظ کرنا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس کی افادیت کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو عوام و خواص دونوں کے لیے فکر و نظر کی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔ یہ سفرنامہ درحقیقت ہمارے دور کے ایک ایسے صاحب نظر عالم دین کے "مشاہدات، تجربات اور تاثرات" کا مجموعہ ہے جسے قدرت نے مسائل و معاملات کو مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت فیاضی کے ساتھ عطا کی تھی۔

مصنف نے حج کے فکر و فلسفے اور بیت اللہ کی عظمت کو اپنے قلبی احساسات کی چاشنی کے ساتھ جس عام فہم اور سلیس انداز سے اجاگر کیا ہے، اردو کے دینی ادب میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ سفرناموں کے مصنف اپنے جذبات و احساسات کا سارا خزانہ عموماً حرم نبوی کے تذکرے پر ہی نچھاور کر دیتے ہیں، اس لیے بیت اللہ کی زیارت کا ذکر کچھ روکھا پھیکا ہی رہتا ہے۔ مولانا اصلاحی نے حرم نبوی کی زیارت کے موقع پر اپنے قلبی احساسات کو جس فطری سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے اس موقع پر انھوں نے اپنے آپ کو روایتی قسم کا عاشق رسول

ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

یہ سفرنامہ مولانا اصلاحی کے منفرد اسلوب تحریر کے ادبی محاسن کا بھی ایک دلکش مرقع ہے۔ ان کے مزاج کی ظرافت کے پھول، ہر مناسب موقع پر قاری کو مسکرانے کا موقع فراہم کرتے ہیں، لیکن پورے وقار، متانت اور شائستگی کے ساتھ۔

مولانا اصلاحی نے اِس سفرنامے میں ۴۲ برس پہلے کے سفری تجربات، سہولتوں اور مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے، ماضی وحال کی تمدنی کیفیات اور انسانی رویوں پر جس انداز سے نقد و تبصرہ کیا ہے، وہ بلاشبہ نصح وخیرخواہی کا ایک ایسا خزینہ ہے، جس کی افادیت میں آج بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ زمانے کی ترقی، سفر کی سہولتوں اور زندگی کی آسائشوں میں اضافے اور حرمین کی توسیع کے باوجود ہمارے زمانے کے عازمین حج کے لیے بھی اِس میں تربیت وتزکیہ اور نصیحت وخیرخواہی کا سامان موجود ہے۔

ہم نے سفرنامے کی عبارت کو اردو املا کے جدید رجحانات کے مطابق ڈھالنے کی سعی کی ہے تاکہ نئی نسل کے قارئین کوئی الجھن محسوس نہ کریں۔ اس کے ساتھ، کاتب حضرات کی رائج کردہ، املا کی ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش بھی کی گئی ہے، جو کمپیوٹر کمپوزنگ میں بھی جوں کی توں اختیار کر لی گئی ہیں۔

مقبول الرحیم مفتی

لاہور

۸ جنوری ۲۰۰۰ء

چند تمہیدی باتیں

میں اپنے سفرِ حج کا کوئی سفرنامہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ سفرِ حج کے بہت سے سفرنامے پہلے سے مختلف لوگوں کے لکھے اور چھپے ہوئے موجود ہیں جو اس سفر سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر میں نے بھی کوئی سفرنامہ لکھ دیا تو اس سے لوگوں کو خاص فائدہ کیا پہنچے گا۔ چنانچہ کراچی میں جب میرے بھائی شیخ سلطان احمد صاحب نے ایک مجلس میں مجھ سے سوال کیا کہ "آپ اس سفر کا سفرنامہ تو لکھیں گے نا؟" میں نے جواب دیا کہ "نہیں' میں اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا" انہوں نے سوال کیا کہ "کیوں؟" میں نے کہا کہ "شاید آپ ہی نے مجھے برنارڈشا کا ایک قول کبھی سنایا تھا جو مجھے بھولا نہیں ہے۔ وہ قول یہ ہے کہ "جب تم کسی کی خودنوشت سوانح عمری پڑھو تو اس بات کو فراموش نہ کرو کہ بیان کرنے کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں اصل حقیقتیں ہوا کرتی ہیں۔" انہوں نے میرا یہ جواب سنا تو مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

برنارڈشا کے اس قول میں خودنوشت سوانح عمریوں پر گہرا طنز چھپا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ سفرنامے بھی کم و بیش اُنھیں کی صف میں آتے ہیں لیکن اس قول کا حوالہ دینے سے میرا مقصد سفرناموں اور خودنوشت سوانح عمریوں کی قدروقیمت گھٹانا نہیں تھا۔ میں خود سفرنامے اور سوانح عمریاں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں اور ان میں سے بعض سے مجھے بڑا فائدہ بھی پہنچا ہے۔ میں درحقیقت اس قول کی آڑ لے کر اپنے آپ کو ایک سفرنامہ لکھنے کی ذمہ داری سے بچانا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں اس وقت دوستوں کے دباؤ میں آ کر کوئی وعدہ کر بیٹھا اور پھر اس وعدہ کو پورا نہ کر سکا تو مجھے دوستوں سے شرمندہ ہونا

میں نے اس سفرنامے میں صرف انھی واقعات و حالات کا ذکر کیا ہے جن کا میرے دل پر کوئی نقش قائم رہ گیا تھا۔ میں نے وہ نقوش بے تکلف دل کے صفحے سے اٹھا کر کاغذ کے صفحات پر رکھ دیے ہیں۔ نہ کسی بات کے یاد کرنے کے لیے حافظے پر زور ڈالا ہے نہ کہیں آرائش بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ کسی ایسی بات کو چھپانے ہی کی کوشش کی ہے' جو دل کے صفحے پر موجود ہو۔

یہ سفرنامہ پڑھنے والوں کی نظر میں جیسا کچھ بھی ہو' میرے دل کا یہ بہرحال ایک عکس ہے۔ اگر یہ عکس اچھا ہے تو میری دعا ہے کہ دوسروں کے دل پر بھی یہ عکس پڑے اور اگر اس میں کوئی خرابی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بھی بچائے اور دوسروں کو بھی محفوظ رکھے۔

امین احسن اصلاحی

پڑے گا۔

علاوہ ازیں اس سفر کے لیے میں جب گھر سے نکلا تھا تو یہ ارادہ کر کے نکلا تھا کہ اپنے امکان کی حد تک اس کو **اصل مقصد** کے سوا ہر دوسری آلائش سے پاک رکھنے کی کوشش کروں گا۔ بڑی آرزوؤں اور بڑی تمناؤں کے بعد کہیں ایک مرتبہ زندگی میں یہ موقع مل رہا تھا۔ معلوم نہیں پھر یہ سعادت نصیب ہو یا نہ ہو' اس وجہ سے میں نے چاہا کہ اصل نصب العین کے سوا کوئی اور چیز نگاہوں کے سامنے نہ آنے پائے۔

اگرچہ ایک شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے کے ارادے سے اس مقصد کی پاکیزگی میں کیوں خلل واقع ہونے لگا تھا؟ میں اس خیال کی تردید نہیں کرتا۔ اس طرح کے معاملات میں خیالات اور تجربات الگ الگ ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کی توجہ اس طرح کی چیزوں سے شاید منتشر نہیں ہوتی لیکن میرا حال اس معاملہ میں بالکل دوسرا ہے۔ میرا دل ڈرتا تھا کہ اگر میں اس سفر پر یہ خواہش ساتھ لے کر نکلوں گا کہ اس کی روداد دوسروں کو بھی سنانی ہے تو ممکن ہے حالات کے مشاہدے میں میرا زاویہ نگاہ بدل جائے۔ ایک سیاح جو سیاحت کے لیے نکلتا ہے اور ایک طالب جو کسی کی جستجو میں نکلتا ہے' دونوں حالات کو ایک ہی زاویے سے نہیں دیکھتے۔ ایک حالات کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ ان کو ایک داستاں کی صورت میں لا کر دوسروں کو بھی سنا سکے اور صرف سنا ہی نہ سکے بلکہ لوگوں کو محظوظ بھی کر سکے' یہ ضرورت اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ داستان کے جس حصہ میں کوئی خلا محسوس کرے وہاں زیب داستان کے لیے اپنی طرف سے اضافے کرے تاکہ اس کے سامعین کی دلچسپی قائم رہ سکے۔ برعکس اس کے ایک طالب کا معاملہ صرف اس کے اور اس کے مطلوب کے درمیان ہوتا ہے' اس میں کوئی تیسرا شریک نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے جو چیز اس کے سامنے جس شکل میں آتی ہے اسی شکل میں وہ اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ اس کو پسند آئے یا نہ آئے۔

بہرحال میرا بالکل ارادہ نہ تھا کہ میں کوئی سفرنامہ لکھوں گا۔ اسی خیال کے تحت میں نے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ حتی الامکان لوگوں سے ملنے جلنے سے

بھی احتراز کرتا ہے' کم از کم یہ کہ اس کے لیے خود اپنی طرف سے کوئی پہل نہیں کرنی ہے۔ یہ بات میں نے اپنے رفیق سفر' حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ایڈیٹر' المنبر' (لائل پور) پر جہاز کے عرشے پر قدم رکھتے ہی ظاہر بھی کر دی تھی۔ لیکن حرمین شریفین میں کم وبیش دو ماہ کے قیام کے دوران میں جو حالات میرے تجربے اور مشاہدے میں آئے' وہ مجھے برابر اس بات پر اکساتے رہے کہ میں اپنے اس فیصلے میں تبدیلی کر دوں۔

اس تبدیلی کے بعض محرکات کا ذکر میں یہاں مناسب خیال کرتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس تبدیلی کے لیے ترغیب دی وہ یہ ہے کہ مجھے بہت سے ایسے نوجوان اور نئے تعلیم یافتہ لوگ ملے جن کے ذہنوں میں سفرحج کے ہر مرحلے اور اس کے اکثر مناسک سے متعلق طرح طرح کے سوالات موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی فطری دینداری یا ان کی خاندانی روایات کے اثر نے ان سوالات کو اعتراضات کی شکل اختیار کرنے نہیں دی ہے۔ وہ حج کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ایک بہت بڑی عبادت سمجھتے ہیں' اور اسی عقیدے کے تحت وہ دوردراز سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے دنیا کے مختلف گوشوں سے آئے بھی تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہنوں کے اندر ایک قسم کی خلش اور بے چینی موجود ہے' اور اس بے چینی میں ان مشاہدات نے بھی بہت کچھ اضافہ کیا ہے جن سے حج کے مختلف مراحل میں وہ گزرے ہیں۔ نیز میں نے محسوس کیا کہ حج سے متعلق اس دوران میں جو لٹریچر انہوں نے پڑھا ہے اس سے ان کے ذہن کی الجھنیں دور نہیں ہوئی ہیں اور وہ اس بات کی شدید ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ حج پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس سے ان کی یہ الجھنیں دور ہوں۔ ان میں سے اکثر نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ یہ خدمت میں انجام دوں۔ اگر ایک مستقل کتاب لکھنا فی الحال ممکن نہ ہو تو ایک سفرنامہ ہی کی شکل میں سہی۔

دوسری چیز جس نے مجھے اس تبدیلی کی ضرورت محسوس کرائی وہ یہ ہے کہ اس سفر کے ہر مرحلے پر میں نے یہ تجربہ کیا کہ سائنس کی ترقیوں نے اس زمانہ میں اگرچہ اس جاں گسل سفر کی صعوبتیں بہت بڑی حد تک کم کر دی ہیں لیکن دوسری طرف مختلف

حکومتوں نے طرح طرح کی بے ضرورت قیدیں اور فضول قسم کی "دفتری" پابندیاں بڑھا کر ان میں بڑا اضافہ کر دیا ہے اور اس سے کہیں زیادہ اضافہ عوام کی بے خبریوں اور ان کی نادانیوں سے ان میں ہو رہا ہے لیکن ان کی اصلاح کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں ہے۔ میں نے خیال کیا کہ سفرنامے کا کم از کم یہ فائدہ تو ہو گا کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو قابل اصلاح چیزوں کی طرف توجہ دلائی جا سکتی ہے۔

تیسری چیز وہ جدید رجحانات ہیں جو حجاز میں اس وقت بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں اور جو حکومت سعودیہ کے لیے بھی قابل غور ہیں اور خود ہمارے لیے بھی قابل غور ہیں۔ اگر ان رجحانات کو اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو اچھی طرح نہ سمجھا گیا اور جلدی نہ سمجھا گیا تو اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ حجاز ہمارا مرکز روحانی ہونے کے سبب سے پورے عالم اسلامی کے جسد کے اندر دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بیماری پورے عالم اسلامی کی بیماری اور اس کی صحت پورے عالم اسلامی کی صحت کے ہم معنی ہے۔ آج جس طرح لاکھوں حاجی وہاں سے حج کی برکتیں لے کر لوٹتے ہیں، اسی طرح اگر وہاں خرابیاں پیدا ہو جائیں تو ان میں بھی لازماً ہمارا حصہ ہو گا اور ہم ان سے کسی حال میں بھی اپنے آپ کو بچا نہ سکیں گے۔

ان محرکات نے مجھے یہ سفرنامہ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مقاصد اس سے پورے ہوں جن کے لیے میں نے یہ زحمت اٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔

اِرادۂ حج

مجھے حج کا شوق بلکہ اس کے لیے اضطراب ایک مدت سے تھا اور عمر جوں جوں گزرتی جاتی تھی یہ اضطراب برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس اضطراب کی تخم ریزی میرے دل میں سب سے پہلے میرے استاد مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر سے ہوئی۔ انھوں نے آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ [اور لوگوں پر اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج کرنا ہے، جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو اور جس نے کفر کیا تو اللہ دنیا والوں سے بے پروا ہے] (۹۷۔ آل عمران) پر دوران درس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حج سے بے پروا ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ یہودی ہو کے مرے گا یا نصرانی ہو کر۔ مولانا کی یہ تقریر آیت کے الفاظ سے اس قدر لگتی ہوئی تھی کہ بات فوراً ہی میرے دل میں اتر گئی۔ لیکن خود بات اس قدر سخت اور دل کو ہلا دینے والی تھی کہ میں اس کو سن کر کانپ گیا۔ مولانا کی اس تقریر کے بعد میں نے خود اس مسئلے پر بار بار غور کیا اور جتنا ہی غور کرتا گیا اتنی ہی اس کی حقیقتیں مجھ پر واضح ہوتی گئیں، لیکن اس بات کی سختی کے سبب سے میرا دل ایک عرصے تک یہی چاہتا رہا کہ میں اس کو مولانا کے ایک تفسیری نکتے سے زیادہ اہمیت نہ دوں، لیکن جب مزید مطالعے سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مولانا کا کوئی اپنا تفسیری نکتہ نہیں ہے، بلکہ حدیث صحیح سے بھی ان کے بیان کی تائید ہوتی ہے تو پھر اس کو ایک قطعی اور واضح حقیقت تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہا۔ اب اگر کوئی چیز میری ڈھارس بندھانے والی باقی رہ گئی تو وہ صرف یہ تھی کہ میں صاحب استطاعت نہیں تھا۔

یہ حج کے لیے میرے اضطراب کا آغاز تھا اور اس اضطراب کی تہہ میں جیسا کہ واضح ہوا یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ حج سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنے والا شخص ایمان پر مرنے کی توفیق ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔

بعد میں اس خوف پر شوق کا اضافہ بھی ہوا اور وہ بھی مولانا مرحوم ہی کی بعض کتابوں سے ہوا۔ میں نے جب مولانا کی تفسیر سورۂ کوثر کا مطالعہ کیا تو اس سے بیت اللہ کی روحانیت کی تصویر میرے سامنے آئی اور یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خانہ کعبہ دنیا میں حوض کوثر کا مجاز ہے' جو شخص دنیا میں اس کوثر پر نہیں پہنچے گا وہ آخرت کے حوض کوثر کی برکتوں سے محروم رہ جائے گا۔ اسی طرح مولانا کی تفسیر سورۂ فیل اور ان کے رسالہ ذبیح کے مطالعے سے مجھ پر قربانی' طواف' حجراسود' رمی جمرات اور دوسرے مناسک کے اسرار کے بعض گوشے بے نقاب ہوئے اور ایسے موثرانداز میں بے نقاب ہوئے کہ میرے دل میں گھر کر گئے۔

یہ خوف اور شوق دونوں چیزیں میرے دل میں عین عنفوان شباب میں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد سے مجھے حج کے لیے جانے والوں پر رشک آنے لگا۔ جب حج کا زمانہ آتا میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی' کہ کاش میرے لیے بھی وہ دن آئے کہ میں احرام باندھے ہوئے ننگے سر لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک کہتا ہوا جدہ کے ساحل پر اتروں' بیت اللہ کا طواف کروں۔ یمین اللہ (حجراسود) کو بوسہ دے کر از سر نو اپنے رب کے ساتھ بندگی کا عہد باندھوں' مقام ابراہیم اور حطیم میں نمازیں پڑھوں' عرفات اور مزدلفہ میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں' منیٰ میں قربانی کروں اور اپنی غلامی کے اعتراف کے لیے سر منڈاؤں اور صفا و مروہ کی سعی کی سعادت حاصل کروں۔

سال کے بعد سال بیتتے گئے اور زندگی کے دن ان ہی حسرتوں میں گزرتے رہے۔ جب تک جوانی کا دم خم باقی رہا گناہوں کا بوجھ بھاری ہونے کے باوجود نہایت ہلکا پھلکا محسوس ہوتا رہا اور اس کی گراں باری سے پست ہمت ہونے کے بجائے دل یہی چاہتا رہا کہ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہے لیکن اب آہستہ آہستہ یہ احساس بھی پیدا ہونا شروع ہوا

کہ یہ بوجھ طاقت سے زیادہ ہے بلکہ کبھی کبھی اس گراں باری کا احساس اس شدت کے ساتھ ہونے لگا کہ معلوم ہوتا کہ کمر ٹوٹی جارہی ہے اور دل بیٹھا جارہا ہے۔ آخر اس بوجھ سے رہائی پانے کی کوئی تدبیر بھی ہے؟ یہ سوال طبیعت میں بار بار پیدا ہونے لگا اور اس شدت و قوت کے ساتھ پیدا ہونے لگا کہ دل و دماغ کے ہر گوشے پر چھا گیا۔

اسی دوران میں ایک حدیث نگاہ سے گزری جس میں بیان ہوا ہے کہ تین کام ایسے ہیں جو آدمی کے تمام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایک کفر سے نکل کر اسلام میں آنا' دوسرا خدا کی راہ میں ہجرت کرنا' تیسرا حج کرنا۔ یہ حدیث نگاہوں سے گزری تو بار بار ہوگی' پڑھی بھی ہوگی اور پڑھائی بھی ہوگی' لیکن کسی چیز کی حقیقی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کی ضرورت نہ ہو۔ اس زمانے میں اس حدیث کا میں بہت محتاج تھا بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو کہ اب اس قسم کے کسی سہارے کے بغیر مجھے زندگی بالکل وبال معلوم ہونے لگی تھی۔ چنانچہ جب یہ حدیث میری نظر سے گزری تو میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے اس سے کتنی خوشی ہوئی' مجھے سکون و راحت اور اطمینان و تسلی کا ایک خزانہ مل گیا۔ میں نے اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے گناہ گار بندوں کی مغفرت کے لیے ایک ایسی راہ بھی کھولی ہے جس پر مجھ جیسے کم ہمت بھی چل سکتے ہیں۔

جہاں تک کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہونے کا تعلق ہے' یہ اتنا بڑا معرکہ ہے کہ اس کو سر کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے ایک مسلمان گھرانے میں اسلام پر پیدا کیا' اسلام میں داخل ہونے کا معاملہ اگر اپنی ہی کوشش اور اپنے ہی اجتہاد پر منحصر ہوتا تو معلوم نہیں کیا بنتا۔ اسی طرح ہجرت کی راہ بھی کوئی آسان راہ نہیں ہے' بڑے ہی جاں باز اور بڑے ہی صاحب عزم تھے وہ لوگ جنھوں نے خدا کے لیے ہر چیز کو چھوڑ دیا۔ اگر ہم کو یہ بازی کھیلنی پڑے تو نہیں معلوم بڑے بڑے مدعیان استقامت و عزیمت کی صفوں میں سے بھی کوئی اس کا اہل نکل سکے یا نہ نکل سکے؟ البتہ حج ایک ایسی چیز ضرور ہے جس کی ہمت ہم جیسے کمزور اور پست ہمت بھی کر سکتے ہیں اور اگر اس سے زندگی بھر کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں تو اس کے سوا اور کیا کما

جا سکتا ہے کہ رب کریم نے اپنی کریمی کے لیے اس کو ایک بہانہ بنایا ہے۔

بہرحال حج کے معاملے میں اس مقام تک میں ایک عرصے سے پہنچا ہوا تھا' بلکہ اگر دل کی کیفیات کوئی قابل لحاظ چیز ہوں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ادھر پچھلے کئی سالوں سے میرا دل حج ہی میں رہا ہے لیکن اس شوق و اضطراب کے باوجود بعض ناقابل ذکر مجبوریاں ایسی سدراہ تھیں کہ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ کبھی میری یہ آرزو پوری ہو سکے گی لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی بات کو چاہتا ہے تو غیب سے اس کے محرکات و اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ میں ادھر کچھ عرصہ سے اپنے گردوپیش سے کچھ ایسا دل شکستہ ہو رہا تھا کہ دل باربار یہ چاہتا تھا کہ اس ماحول کو چھوڑ کر کم از کم کچھ ہی دنوں کے لیے کہیں چلا جاؤں۔ اس مقصد کے لیے بہترین جگہ جس کا میں انتخاب کر سکتا تھا' وہ خدا کا گھر ہی ہو سکتی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کا سامان کر دیا اور اپنی جس دیرینہ تمنا کے پوری ہونے کی توقع میں نہیں کرتا تھا وہ تمنا خدا نے پوری کر دی۔

اس دوران میں اپنے رب کی عنایات کی جو کرشمے میں نے دیکھے ہیں' نہ میں ان کا اندازہ کر سکتا تھا اور نہ ان کو بیان کر سکتا تھا۔ یہ سفرنامہ میں سردھانا جہاز میں' سفرحج سے واپس ہوتے ہوئے اپنے کیبن کے سامنے بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ سامنے پھیلا ہوا سمندر ہے اور اس میں آج کسی قدر تلاطم ہے لیکن اس سے زیادہ تلاطم میرے دل میں اس خوشی نے پیدا کر رکھا ہے کہ مجھ جیسے گناہ گار بندے کو اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق بخشی اور میں اب اس فریضہ سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کو لوٹ رہا ہوں۔ جہاز کے ایک افسر نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے کہ اب ہمارے سفر کا زیادہ حصہ طے ہو چکا ہے اور اب ہم کراچی سے بہت قریب ہیں۔

سفر کی پہلی منزل

سفر کا ارادہ کر لینے کے بعد سب سے پہلا سوال رفقائے سفر سے متعلق دل میں پیدا ہوا۔ یوں تو رفقائے سفر کی اہمیت ہر سفر میں ہے لیکن سفرحج میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ سفر ایک بڑی سخت کسوٹی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے رفقا کا انتخاب کچھ آسان نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ اس سفر میں' اخویم شیخ سلطان احمد صاحب (کراچی) ڈاکٹر عثمانی صاحب (کراچی) حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب (لائل پور) اور میری اہلیہ کی رفاقت مجھے حاصل ہو سکے۔ اس انتخاب میں محبت اور اعتماد کے علاوہ اس بات کو بھی دخل تھا کہ مقدم الذکر دو رفیق اس منزل کے راہ و رسم سے پہلے سے واقف تھے۔ لیکن یہ میری اپنی خواہش تھی' اس کے پورے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی لکھی ہوئی تقدیر پر تھا۔ میں نے سلطان احمد صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو اپنے ارادۂ سفر کی اطلاع دی اور ان کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ عبدالرحیم اشرف صاحب کے حالات اگرچہ سازگار نہ تھے لیکن وہ اللہ کا نام لے کر آمادہ ہو گئے۔ سلطان احمد صاحب نے بعض مجبوریوں کی بنا پر عذر کیا۔ ان کے عذر کر دینے کے بعد میں نے ڈاکٹر عثمانی صاحب کو لکھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ حضرات جب بھی جائیں' ایک ساتھ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ البتہ ان دونوں صاحبوں کی بجائے لاہور کے دو نوجوان رفیق مولوی برکت علی صاحب اور ملک اسلم آمادۂ رفاقت ہو گئے۔ ان دونوں دوستوں کے آمادہ ہو جانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس خوشی میں کچھ دخل میری خودغرضی کو بھی تھا۔ سفر تو مجھے زندگی میں بہت کرنے پڑے ہیں' چھوٹے بھی اور بڑے بھی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں سفر کے معاملے میں بڑا کچا واقع ہوا ہوں' اس وجہ سے

میری دلی خواہش تھی کہ ایک دو رفیق ایسے مل جائیں جو ضرورت کے وقت میری مدد کر سکیں اور ان کی امداد نہ ان کے لیے موجب تکلیف ہو نہ میرے لیے موجب تکلف۔ اس سفر میں میری خاص مشکل یہ تھی کہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ سفر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عورت کا ساتھ ہو تو چاہے مشکلات سفر میں کوئی خاص اضافہ نہ ہو' لیکن فکر سفر دوچند ضرور ہو جاتی ہے۔

ایک مختصر سے قافلے کی شکل بن جانے کے بعد درخواستیں بھیج دی گئیں۔ ہمارے پاکستان میں جہازوں کی کمی اور زرمبادلہ میں کفایت کے سبب سے عازمین حج کی درخواستوں کا فیصلہ قرعے کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ درخواستیں بھیج دینے کے بعد ایک خاموش تشویش کے ساتھ انتظار ہونے لگا کہ دیکھیے قرعے کی زبان کیا فیصلہ صادر کرتی ہے؟ بڑی اللہ آمین کے بعد معلوم ہوا کہ قرعے میں میرا' میری اہلیہ کا اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا نام آگیا ہے لیکن ہمارے دو رفیقوں کے نام نہیں آئے۔ قرعے کے عام قاعدے کی رو سے ایک پارٹی کے سارے درخواست دہندوں کا ایک ہی حشر ہونا تھا' یا تو سب فائز المرام یا سب نامراد' اس وجہ سے تعجب ہوا کہ قرعے نے یہ امتیاز کیوں برتا؟ اس معمے کو حل کرنے کے لیے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے کراچی کا سفر کیا۔ معلوم ہوا کہ بعض ٹیکنیکل غلطیوں کے سبب سے ہمارے دو رفیقوں کی درخواستیں شامل قرعہ نہ ہو سکیں اگرچہ اس بات سے صدمہ تو بہت ہوا' لیکن فیصلہ تقدیر کے آگے سرتسلیم خم کرنے کے سوا اور کیا چارہ کار تھا۔

درخواستیں منظور ہو جانے کے بعد پاسپورٹ اور ہیضہ اور چیچک کے ٹیکوں کے سٹیفکیٹ حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ ہیضہ کے ٹیکوں کے لیے شرط تھی کہ دو (۲) ہوں اور ان دونوں کے درمیان شاید آٹھ دنوں کا وقفہ ہو' اور اگر اس میں بدقسمتی سے ایک دن کی بھی تقدیم و تاخیر واقع ہو جائے تو پچھلا کورس منسوخ۔ پھر سے اس ترتیب اور انھی آداب و شرائط کے ساتھ دوسرا کورس شروع کرایئے۔ پھر بین الاقوامی فارم پر سرٹیفکیٹ حاصل کیجیے' اور چونکہ یہ سرٹیفکیٹ عام ڈاکٹروں سے حاصل نہیں کیے جا سکتے تھے بلکہ

محکمہ صحت کے ڈاکٹروں ہی سے حاصل کیے جاسکتے تھے' اس وجہ سے ان کے حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو کافی دوڑدھوپ بھی کرنی پڑتی تھی۔ اور اکثر حالات میں رشوتیں بھی دینی پڑتی تھیں۔ یہ مرحلہ طے کر چکنے کے بعد پاسپورٹ کی فکر ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پاسپورٹ کا معاملہ نسبتاً آسانی سے طے ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دفتر میں ایک دین دار مسلمان تھے جنھوں نے یہ کام نہایت مستعدی اور ہمدردی کے ساتھ انجام دیا۔

معلم کا انتخاب

اسی مرحلے میں معلم کا انتخاب کرلینا بھی ضروری تھا۔ معلم کے بغیر حج اور سفر حج کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری تھا کہ معلم کا تعین کر لینے کے بعد اس کا نام نامی اپنے تمام چھوٹے بڑے سامان پر جلی خط میں لکھوا دیا جائے کیونکہ جدہ کے ساحل پر قدم رکھتے ہی آدمی کی اپنی ہستی بالکل فنا ہو کر معلم کی ہستی میں گم ہو جاتی ہے۔

مجھے بدقسمتی سے معلم کے نام سے وحشت تھی۔ میں نے شروع ہی سے حج کا تجربہ رکھنے والوں کو معلموں کے برے ہونے پر اس طرح متفق اللفظ پایا تھا کہ شاید ہی اس بارے میں کسی کا اختلاف رائے منقول ہو۔ حتیٰ کہ جو لوگ سرزمین حجاز کی کسی خراب سے خراب چیز کو بھی خراب کہنا خلاف دین داری سمجھتے ہیں انھوں نے بھی کم از کم معلم کا گلہ تو ضرور کیا ہے۔ اس وجہ سے میں سخت پریشان تھا کہ دیکھیے تقدیر ہماری باگ کس کے ہاتھ میں پکڑاتی ہے۔ کبھی کبھی خیال آیا کہ معلم کی پابندی کیا ضروری ہے؟ کیوں نہ ہم معلم کے بغیر ہی حج کر ڈالیں۔ میں نے دبی زبان سے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے کہ اس کا تو تصور بھی نہ کرو۔ معلم حج کے سلسلے کی ایک ناگزیر برائی ہے جس سے تم کسی صورت میں نہیں بچ سکتے۔

اس بات کے بعد کہاں گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ ایک عازم حج' معلم سے گریز کی کوئی راہ سوچ سکے۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے

لکھا کہ معلم کی حیثیت سے سید عقیل عطاس اچھے رہیں گے۔ میں ان کے بارے میں پہلے سے کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا۔ حکیم صاحب نے میری طبیعت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی سفارش میں صرف یہ بات لکھی کہ ان کے پاس حاجی کم آتے ہیں اس لیے کہ یہ دلالوں اور ایجنٹوں کو حاجیوں کے پھانسنے کا ذریعہ نہیں بناتے۔ مجھے یہ بات پسند آئی اور میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے تمام سامان پر ان کا نام لکھوا دیا۔ بعد میں برادرم باقر خاں صاحب (ملتان) اور سید عبدالعزیز شرقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان دونوں دوستوں نے بھی اپنے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر اس انتخاب کی تائید کی۔ باقر خاں صاحب نے عقیل صاحب کی کم آمیزی اور خشکی کی تھوڑی سی شکایت بھی کی لیکن مجھے اس سے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ جو آدمی کم آمیز اور کم سخن ہو گا وہ چرب زبانی' اور سخن سازی کے بجائے اپنے حسن خدمت پر اعتماد کرتا ہو گا' الحمدللہ' بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

ضروریات سفر اور ذہن کی تیاری

ضروریات سفر کے متعلق میں نے برادرم سلطان احمد صاحب کو لکھا کہ اس سفر کے لیے جو چیزیں ضروری ہوں ان کی تفصیلی فہرست بنا کر بھیج دیں' انہوں نے دو فہرستیں بنا کر بھیج دیں۔ ایک میں وہ چیزیں درج تھیں جو ہمیں لاہور سے ساتھ لینی تھیں اور دوسری وہ چیزیں تھیں جو کراچی سے لینی تھیں۔ ہم نے اس فہرست کے مطابق سامان تیار کرایا لیکن ہم سلطان صاحب کے مشوروں کے ساتھ حج کا تجربہ رکھنے والے دوسرے مشیروں کے مشوروں سے بھی مستفید ہوتے رہے۔ جو مخلصین ملنے آتے' وہ اپنے اپنے تجربات کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ مشورے ضرور دے جاتے اور ہم چونکہ اس کوچہ سے بالکل ہی نابلد تھے' اس وجہ سے قدرتی طور پر ہر ایک کے مشوروں سے کچھ نہ کچھ متاثر بھی ہو جاتے۔ اس طرح ہمارا سامان چلتے وقت تک بار بار بندھتا اور کھلتا رہا۔ میں سفر میں سامان سے چونکہ سخت گھبراتا ہوں' اس وجہ سے ہر وہ مشورہ جو سامان کم کرنے کے بارے

میں ہو' مجھے پسند آ جاتا' لیکن تجربے نے ثابت کیا کہ اس سفر میں سامان کے کم لینے کا وہ رجحان جو میرے اندر پایا جاتا ہے' صحیح نہیں ہے۔ ضرورت کی چیزیں ضرور ساتھ ہونی چاہئیں اگرچہ ان کے سبب سے راستے میں کچھ زحمت بھی ہو۔

مادی تیاری کے ساتھ ساتھ ذہنی تیاری کی بھی ضرورت تھی۔ حج کے احکام و مناسک پر جو کچھ پڑھا تھا اب تک اس کی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی تھی اس لیے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کتنا حصہ ذہن میں محفوظ ہے اور کتنا ضائع ہو چکا ہے۔ اب ضرورت پیش آئی تو خیال ہوا کہ پچھلی معلومات کا جائزہ لیا جائے۔ مفصل و مطول کتابیں پڑھنا تو سفر کی اس تیاری میں مشکل تھا۔ اس وجہ سے خیال ہوا کہ حج کے احکام و مناسک پر لوگوں کے لکھے ہوئے عام رسائل جو ملتے ہیں' ان میں سے کوئی قابل اعتماد رسالہ پڑھ لیا جائے۔ مخدوم مکرم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کا ایک رسالہ عرصہ ہوا میں نے پڑھا تھا اور وہ مجھے پسند آیا تھا۔ میں نے اس کے لیے ان کو لکھا۔ انہوں نے ازراہ نوازش اپنا رسالہ بھی بھیج دیا اور ساتھ ہی بعض دوسرے رسالے بھی بھیج دیے۔ نیز میرے رجحان طبع کا لحاظ رکھتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ کے رسالے مناسک الحج کے لیے یاددہانی کی کہ تم اس کو پڑھو۔ یہ تمہیں پسند آئے گا۔ بعض رسالے محمد عاصم حداد صاحب نے بھی فراہم کر دیے۔ اگرچہ سفر کی تیاریوں اور ملاقاتیوں کی آمدوشد کے سبب سے ان کتابوں کے پڑھنے کا موقع بہت کم مل سکا' تاہم میں نے اکثر رسالے پڑھ ڈالے اور ان کی ضروری باتیں محفوظ کر لیں جو نہ پڑھ سکا ان کو اطمینان کے ساتھ جہاز میں پڑھنے کے لیے ساتھ رکھ لیا۔ ان میں سے مولانا محمد منظور نعمانی کا رسالہ میری اہلیہ کو بہت پسند آیا اور امام ابن تیمیہؒ کے رسالے سے میری بہت سی الجھنیں دور ہوئیں۔

گھر کا انتظام

ہم میاں بیوی دونوں کے سفر پر روانہ ہو جانے کے بعد ہمارے گھر کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی ایک ٹیڑھا مسئلہ تھا اور اس سے زیادہ ٹیڑھا مسئلہ مدرسہ اصلاح البنات کی نگرانی

کا تھا جو میری اہلیہ نے بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا ہے اور جو اب خدا کے فضل سے کافی ترقی کر چکا ہے۔ ہمارے بعد گھر پر صرف میری ساس اور میری چھوٹی بچی مریم صدیقہ سلمہا باقی رہ جاتی تھیں۔ میری ساس برسوں سے صاحب فراش ہیں۔ اس وجہ سے جتنا اہم مسئلہ بچی کی نگرانی کا تھا اس سے زیادہ اہم سوال والدہ صاحبہ کی تیمارداری کا تھا۔ میرے دونوں لڑکے جو پاکستان میں ہیں، راولپنڈی میں رہتے ہیں جن میں سے ایک زیر تعلیم ہے اور دوسرے کو اپنے اخبار سے فرصت نہیں۔ خیال ہوا کہ مریم کو ساتھ لیتے چلیں، لیکن اس میں دوسری بہت سی مشکلات کے علاوہ ایک بہت بڑی مشکل یہ تھی کہ میری ساس، میری اہلیہ کو حج کی اجازت دینے پر راضی ہی اس شرط پر ہوئی تھیں کہ میری دونوں لڑکیاں ان کے ساتھ رہیں۔ اس وجہ سے اس کے سوا کوئی اور شکل نظر نہیں آئی کہ بڑی لڑکی کو اس کے گھر سے بلایا جائے اور اماں کو، اور مریم کو اس کے حوالے کیا جائے۔ اس کے متعلق جب میں نے اپنے داماد نعمان شبلی سلمہ کو خط لکھا تو انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کو خوشی سے اجازت دے دی بلکہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہفتہ میں ایک بار بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملتان سے لاہور آتے رہیں گے۔ میرے لاہور کے دوستوں میں سے مولوی محی الدین سلمہ اور مولوی برکت علی صاحب نے بھی وقتاً فوقتاً دیکھ بھال کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔ مدرسہ کا داخلی انتظام مدرسہ کی استانیوں اور خارجی نظم و نسق برادرم رانا اللہ داد خاں صاحب کے سپرد کیا گیا۔

کراچی روانگی

ہمیں سردھانا جہاز سے سفر کرنا تھا جو کراچی سے جدہ کے لیے ۱۸ مئی ۵۸ء کو روانہ ہونے والا تھا۔ ہم نے خیال کیا کہ جہاز کی روانگی سے زیادہ سے زیادہ دو تین دن پہلے کراچی پہنچ جانا کافی ہو گا۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہم نے پروگرام بنایا اور سلطان احمد صاحب کو کراچی اس کی اطلاع دے دی۔ سفر کی تیاریاں اس لحاظ سے جاری تھیں کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے احتیاطاً حج آفیسر کو ٹرنک کال کیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ

ہمیں جہاز کی روانگی کی تاریخ سے ایک ہفتہ پیشتر کراچی پہنچ جانا چاہیے، تاریخ سفر کی اس فوری تبدیلی سے سخت پریشانی ہوئی۔ کپڑے دھوبی یا درزی کے پاس ہیں، روپے کسی کے پاس ہیں اور وہ کسی ضرورت سے باہر گیا ہوا ہے، عزیزوں اور دوستوں کو ایک خاص تاریخ کی اطلاع ہو چکی ہے اور اب دوسری اطلاع کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، اس طرح کے متعدد مسائل سامنے آن کھڑے ہوئے، لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا کہ اپنے سارے پروگرام کو درہم برہم کر کے حج آفیسر کے حکم کی تعمیل کی جائے چنانچہ ہم اسی افراتفری کے عالم میں اپنے اپنے گھروں سے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

گھر سے روانگی کے وقت ہم نے دو دو رکعت نفل پڑھ کے سفر کی مسنون دعائیں کیں۔ میری اہلیہ نے اپنی والدہ سے رو رو کر اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی اور سفر کی اجازت چاہی۔ میں نے بھی ان سے معافی اور دعا کی درخواست کی۔ جواب میں ان کی طرف سے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔ یہ بے چاری ہمارے لیے ہمیشہ سراپا دعا رہی ہیں۔ اس کے بعد میں نے گھربار کو خدا کو حوالے کیا۔ میری خواہش تھی کہ بچے اسٹیشن جانے کے لیے ضد نہ کریں لیکن میں نے دیکھا تو سب تیار کھڑے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے ننھے سے سلمان سلمہ بھی تیار ہیں، ان کے شوق کو دیکھ کر میں نے ان کو روکنے کی کوشش مناسب نہیں سمجھی۔

گاڑی آئی جو احباب و مخلصین اسٹیشن پر آ گئے تھے، ان سے رخصت ہوا۔ بچوں کو پیار دیا اور مسنون دعا کے ساتھ ان کو خدا کے حوالے کیا۔

اس موقع پر مجھے ایک اندیشہ تھا، وہ یہ کہ مریم سلمہا اپنی ماں سے کبھی جدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ماں اور بیٹی دونوں کو جدائی کا تجربہ کرنا تھا، مجھے بڑا خطرہ تھا کہ یہ منظر رقت انگیز بن جائے گا، اور بہت ممکن ہے کہ یہ میرے دل پر کوئی ایسا نقش چھوڑ جائے جو پورے سفر میں قائم رہے، لیکن الحمدللہ کہ اس طرح کی کوئی بات پیش نہیں آئی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بچی نے اپنی ماں کی تربیت کا نہایت گہرا اثر قبول کیا ہے اور

اب وہ ماشاء اللہ سمجھ دار ہو گئی ہے۔

راستے کے احباب میں سے میں نے کسی کو اپنے سفر کی اطلاع نہیں دی تھی' صرف نعمان میاں کو ملتان اور سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری کو رحیم یار خاں اطلاع بھجوانے کی کوشش کی۔ لیکن پروگرام کی فوری تبدیلی کے بعد مجھے توقع نہیں رہی تھی کہ ان کو اطلاع پہنچ سکی ہو گی مگر میری توقع کے خلاف ملتان اسٹیشن پر نعمان سلمہ اپنی ہمشیرہ' ان کے بچوں اور ہمارے لیے زادراہ کے ساتھ موجود تھے اور رحیم یار خاں کے اسٹیشن پر سردار محمد اجمل خاں صاحب' امین لغاری صاحب اور متعدد احباب و متعلقین موجود تھے۔

کراچی کے متعلق بھی مجھے اندیشہ تھا کہ شاید پروگرام کی اطلاع صحیح وقت پر سلطان احمد صاحب کو نہ پہنچ سکی ہو۔ لیکن اسٹیشن پر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ نہ صرف وہ خود موجود ہیں بلکہ دوسرے تمام احباب بھی موجود ہیں یہاں تک کہ میری اہلیہ کو لینے کے لیے شاہدہ سلمہا بھی آئی ہوئی ہیں۔ ہم مسنون دعائیں پڑھتے ہوئے کراچی اسٹیشن پر اُترے اور سلطان صاحب کے مکان واقع پیرالٰہی بخش کالونی کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی میں ایک ہفتہ

جہاز کی تاریخ روانگی کے لحاظ سے ہمیں پورا ہفتہ کراچی میں گزارنا تھا۔ جس سفر کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں' صرف زرمبادلہ اور ٹکٹ کا مرحلہ باقی ہو' اس کے لیے پورا ہفتہ کراچی میں ضائع کرنا طبیعت پر بڑا شاق گزرا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے ابھی وقت کی قدروقیمت نہیں پہچانی ہے' حالانکہ ریلوں' دخانی جہازوں اور ہوائی جہازوں کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ ان سے وقت کی بچت ہوتی ہے۔ اب یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو جہاز چھ دنوں میں کراچی سے جدہ پہنچا دیتا ہو' محض اس پر مسافروں کو لادنے میں ہم پورے سات دن کھپا دیں۔ پھر سائنس کی ان ترقیوں کا ہمیں فائدہ کیا ہوا؟ مالی اعتبار سے بھی اس صورت حال کی تحسین نہیں کی جا سکتی۔ میں تو خیر اپنے ایک دوست کا مہمان تھا لیکن میرے جن ساتھیوں کو کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا' وہ

کافی زیربار ہوئے اور جو بے چارے اسی جہاز کے لیے کراچی کے حاجی کیمپ میں ٹھہرے ہوں گے' ان کی تکلیفوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

بعض دوستوں کی طرف سے خواہش کی گئی کہ ان فارغ دنوں میں ایک تربیتی پروگرام جاری کر دیا جائے۔ لیکن میں اس کے لیے تیار نہ ہوا کیونکہ وقت اگرچہ فارغ تھا صرف ملنے جلنے والوں کی نذر ہو رہا تھا' لیکن ایک اہم سفر درپیش ہونے کے سبب سے میرا ذہن فارغ نہ تھا۔

کراچی میں اترتے ہی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب وغیرہ نے زرمبادلہ اور ٹکٹ کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ مجھے اس سلسلے میں بعض کاغذات پر دستخط کے سوا اور کچھ کرنا نہیں پڑا۔ لاہور کے پاسپورٹ آفس کی طرح یہاں بنک میں بھی تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک دین دار مسلمان مل گئے اور انھوں نے سارا کام ممکن عجلت کے ساتھ کر دیا۔

البتہ ایک کام مجھے بھی کرنا پڑا اور وہ خاصا تکلیف دہ رہا۔ لاہور میں ہم نے چیچک اور ہیضے کے جو ٹیکے کرائے تھے' معلوم ہوا کہ ان کا یہاں بھی معائنہ ہو گا اور اس کے لیے مجھے بھی اور میری اہلیہ کو بھی حاجی کیمپ جانا پڑے گا۔ جس چیز کے سرٹیفکیٹ اتنے اہتمام کے ساتھ اپنے اپنے ضلعوں میں حاصل کیے جا چکے ہوں' اسی چیز کے لیے یہ مزید تکلف اور اہتمام کچھ سمجھ میں نہیں آیا' لیکن چونکہ ہم حج کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ میں جو صعوبتیں اور جو ذلتیں پیش آئیں' ان کو چپ چاپ برداشت کریں' چنانچہ ہم اس کام کے لیے مقررہ وقت پر حاجی کیمپ پہنچے۔ جس کمرے میں معائنہ ہونے والا تھا وہ نیچی چھت کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اگرچہ ان دنوں کراچی میں گرمی کا بڑا زور تھا' لیکن بجلی کی فراوانی کے باوجود اس کمرے میں کوئی پنکھا نہیں تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں سینکڑوں مرد اور عورتیں' بچوں کے ساتھ بھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کے شوروہنگامے اور بچوں کی چیخم دھاڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ گرمی کی وہ شدت کہ الاماں!—— بیٹھنے کے لیے صرف اسٹول طرز کی چند

بینچیں تھیں، جن پر "سابقون الاولون" بیٹھے ہوئے تھے، باقی سارے لوگ خواہ وہ بوڑھے ہوں یا بچے یا عورتیں، ڈاکٹر صاحب کی میز کے یمین و یسار کھڑے تھے۔ لطف یہ کہ خود ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔ صرف ان کے کمپونڈر صاحب موجود تھے جو لوگوں کے سرٹیفکیٹ لے لے کر جمع کرتے جاتے تھے۔ بعض نیک دل حاجی خود تو پسینہ سے شرابور تھے لیکن ان کمپونڈر صاحب کو پنکھا جھل رہے تھے۔ یا تو ان کو یہ غلط فہمی تھی کہ یہی ڈاکٹر صاحب ہیں یا یہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے مقرب ہیں، ان کا کام جلدی کرا دیں گے۔

میں نے اپنی اہلیہ کو بڑی مشکل سے ایک کونے میں بٹھایا اور خود ایک دوسرے کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہو گئیں، تو مجھے خیال ہوا کہ اب آن پر زیادہ مرنا اچھا نہیں ہے کہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ زمین پر ہی سہی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ لوگ کمرے میں داخل ہونے والے کمپونڈر کو ڈاکٹر سمجھ کر پاس کی بنچ سے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے میں نے موقع کو غنیمت جانا اور بنچ پر بیٹھ گیا اور یہ فیصلہ کر کے بیٹھا کہ میں آخری شخص ہوں گا جو اس بنچ پر سے اُٹھے گا۔ اگرچہ میں بے شمار کھڑے ہوئے آدمیوں کے اندر اس طرح بیٹھا ہوا کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ایک آدمی سرکنڈوں کے کسی گھنے جنگل کے اندر چھپا ہوا بیٹھا ہو۔ تاہم میں نے اسی کو اپنی ایک بڑی کامیابی سمجھا۔

ڈھائی تین گھنٹے کے بعد جب مطلع ذرا صاف ہوا، تو میں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ ان کو دیکھا تو وہ ہوا کی تلاش میں اپنی جگہ چھوڑ کر ایک اور جگہ دیوار کا سہارا لیے بیٹھی ہیں۔ وہ اٹھیں تو میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر صاحب کے سامنے معائنہ کے لیے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ٹیکوں کے نشان دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائے بغیر ہمارے فارموں پر ٹک مارک لگا دیے——— ایک بالکل غیرضروری اور بوگس کارروائی کے لیے یہ مشقت میری طبیعت پر نہایت شاق گزری، لیکن خاموشی کے ساتھ برداشت کر لینے کے سوا چارہ نہیں تھا———'

ہم اس دار الابتلا سے چھوٹ کر گھر واپس لوٹنے کے لیے جب رکشا میں بیٹھے تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیسی گزری! مجھے اندیشہ تھا کہ وہ غصہ سے بھری ہوں گی اور سارا غصہ میرے اوپر نکالیں گی، لیکن میرے اندیشہ کے بالکل خلاف وہ نہایت ٹھنڈے لب و لہجہ میں بولیں کہ اس راہ میں سب کچھ جھیلنا عبادت ہے، تکلیف تو ہوئی مگر اللہ کا شکر ہے کہ کام ہو گیا۔ میں نے کہا تمہارا خیال صحیح ہے ہمارے لیے تو یہ عبادت ہے ہی۔ یہ ہمارے ارباب کار بھی ہمارے ستانے کے لیے یہ طریقے عبادت سمجھ کر ہی اختیار کرتے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ ان تکلیفوں اور ذلتوں سے حاجیوں کے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

حاجی کیمپ

اس سلسلے میں بالکل پہلی مرتبہ کراچی کا مشہور حاجی کیمپ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کی شکایتیں مختلف دوستوں کی زبانی سنی تو بار بار تھیں، لیکن صحیح صورت حال کا اندازہ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ہوا۔ یہ حاجی کیمپ اس نظریے پر تعمیر ہوا ہے کہ عازمین حج دھوپ اور سردی گرمی کے احساس سے عاری ہوتے ہیں۔ اس میں عورتوں کے لیے پردے کی ضرورت کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ جن کو پردے کا احترام ملحوظ تھا انھوں نے رسیاں تان تان کر ان پر کھیس اور چادریں ڈال رکھی تھیں۔ عورتوں کے غسل کرنے کے لیے بھی کسی باپردہ جگہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جو بچاریاں نہانا چاہتی تھیں ان کی پردہ پوشی کے لیے صرف اڑھائی تین فٹ اونچی ایک دیوار کافی سمجھی گئی تھی۔

ہمارے دوست حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے یہ صورت حال دیکھی تو انھوں نے منتظمین کو توجہ دلائی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم عورتوں کے نہانے کی لیے کسی باپردہ جگہ ہی کا وہ انتظام کر دیں۔

منتظمین نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ گذشتہ گیارہ بارہ سالوں میں ان سے اس

طرح کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا لیکن جب کچھ ردوقدح کے بعد ان پر یہ حقیقت واضح کی گئی کہ کسی بات کے معقول ہونے کے لیے تنہا یہی دلیل نہیں ہوتی کہ مطالبہ کیا جائے تو انھوں نے ایک قنات کا انتظام کر دیا۔

ایک اسلامی حکومت میں حجاج کے ساتھ یہ سنگ دلانہ سلوک اور وہ بھی عین مرکز حکومت میں نہایت افسوسناک بھی ہے اور نہایت شرمناک بھی ہے۔

کراچی سے جدہ

کراچی تک کے سفر کو تو مجھے سفر نہیں شمار کرنا چاہیے کیونکہ جہاں تک کم از کم میرا تعلق ہے، کراچی میرے لیے بمنزلہ گھر کے ہے۔ یہاں میرا سارا وقت دوستوں سے ملنے جلنے میں صرف ہوتا رہا۔ اس دوران میں میں نے کسی مختصر سے مختصر پروگرام کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہیں لی تاکہ ذہن ہر قسم کے تردد سے آزاد رہے۔ سفر کے جو انتظامات باقی رہ گئے تھے وہ برادرم سلطان احمد صاحب سے متعلق تھے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے پہچاننے اور ان کو ٹھیک ادا کرنے کے معاملہ میں صرف آپ اپنی نظیر ہیں۔ البتہ کراچی کے بعد سے فی الواقع سفر شروع ہونے والا تھا۔

مجھے سمندر اور جہاز کی کچھ ایسی فکر نہیں تھی۔ میں اس سے پہلے بحری سفر کے دو تجربے کر چکا تھا اور سمندر کے سرد و گرم سے اچھی طرح واقف تھا۔ فکر جو کچھ تھی وہ اس سفر کی مخصوص نوعیت کی وجہ سے تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے اور وہ پریشان کرتے۔ اگرچہ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے سارے کام پروگرام کے مطابق انجام پا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک گہرے قسم کا تردد میرے ذہن پر برابر مسلط رہا۔ میں نے اس تردد کو اپنے امکان کی حد تک دوستوں سے چھپایا۔ صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا کہ مجھے یکسوئی اور اعتماد کی دولت نصیب ہو اور اگرچہ میں ایک نہایت ہی گناہ گار اور آلودہ بندہ ہوں لیکن وہ مجھے قبول فرمائے، اور ان مبارک اور پاک مقامات تک پہنچائے جن تک پہنچنے کے لیے میں گھر سے نکلا ہوں۔

جہاز کی روانگی کے دن (۱۸ مئی کو) ہم ظہر سے پہلے گھروں سے بندرگاہ کے لیے روانہ ہو پڑے۔ یہاں ہمیں کسٹم کے مرحلے سے گزرنا تھا جس کی دارو گیر اور جس کا شور و ہنگامہ

ضرب المثل ہے۔ میں نے دل میں باربار دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے تمام پیش آنے والے حالات سے عہدہ برا ہونے کی ہمت دے۔ پہلے ہمارا سامان کسٹم کے پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ پھر ہم خود داخل ہوئے۔ یہاں تک کہ سارے مراسم سلطان احمد صاحب نے انجام دلائے' اس وجہ سے مجھے کسی ناگوار صورت حال سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ لیکن سلطان احمد صاحب کسٹم کے احاطے کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے اب یہاں سے سارے حالات سے ہمیں خود عہدہ برا ہونا تھا۔ پہلے مرحلے میں وہاں کے ہجوم اور شوروہنگامے کا میرے دماغ پر بہت برا اثر پڑا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے زیادہ میری بیوی اس محشر کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ میں نے ان سے کہا' گھبراؤ نہیں' ہمیں آگے کے مراحل میں جگہ جگہ اس طرح کے حالات سے گزرنا ہے' اس وجہ سے اب گھبرانے کی بجائے صبر اور ہمت کے ساتھ ان چیزوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو گئیں اور اول اول مجھ پر جو پریشانی طاری ہوئی تھی وہ بھی دور ہو گئی۔

یہاں ہمیں اکٹھے تین چار کام کرنے تھے' کسٹم والوں سے اپنے سامان کا معائنہ کرانا تھا۔ پولیس والوں سے پل گرم پاس [Pilgrim Pass] پر مہر لگوانی تھی۔ زرمبادلہ کے فارم پر بھی کچھ لکھوانا تھا اور سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اپنے ہیضے اور چیچک کے ٹیکوں کا معائنہ کرانا تھا۔ اپنے اپنے اضلاع سے لے کر کراچی تک ہم ان ٹیکوں کا باربار معائنہ کراتے پھرے لیکن ہمارے محافظین صحت اور ہمارے کارپردازانِ حج کو کسی طرح اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے فی الواقع یہ ٹیکے لگوائے بھی ہیں۔

کسٹم کے احاطے کے اندر جمع شدہ ہجوم کی اکثریت کو نہ تو یہ پتہ تھا کہ یہاں ان کو کیا کیا کام کرنے ہیں اور نہ یہ پتہ تھا کہ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے ان کو کس ترتیب کے ساتھ کن کن مقامات سے گزرنا ہے۔ اس بے خبری کی وجہ سے عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پوچھتا پھرتا تھا' لیکن ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر بے خبر تھا۔ لاؤڈ سپیکر سے کچھ اعلانات وہاں باربار ہو رہے تھے' لیکن ان اعلانات کا اس

کے سوا مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہاں کے شور میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

ہر ایک کا سامان قلیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگرچہ ان قلیوں کی قمیصوں پر "مفت" "مفت" کا لفظ بکثرت لکھا ہوا تھا لیکن یہ نہایت گراں بھی تھے اور نہایت بے رحم بھی۔ ہزار دقتوں کے بعد جب سامان کے معائنہ سے کسی طرح فرصت ملی تو پاسپورٹ اور ٹیکوں کے فارم چیک کرانے کی فکر ہوئی۔ خیریت تھی کہ یہاں عورتوں کے لیے الگ انتظام تھا۔ حاجی کیمپ کی طرح عورتوں اور مردوں' سب کو ایک ہی جگہ نہیں جمع کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کی رہنمائی کی اور وہ جلدی سے معائنہ کرا کے آ گئیں۔ پھر مجھے اپنی فکر ہوئی لیکن میں نے دیکھا کہ ایک نہایت لمبی قطار کھڑی ہے اور وہ شاید ۹ بجے صبح سے اسی حالت قیام میں ہے۔ کام اتنی سست رفتاری سے ہو رہا تھا کہ مجھے شام تک ختم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں اس قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا تو ذلت اور تکلیف کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ اس وجہ سے قطار میں کھڑے ہونے کی بجائے میں سب سے الگ ہو کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور اس بنچ سے اس وقت تک نہ اٹھا جب تک یہ سارا ہنگامہ ختم نہیں ہو گیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر صاحبان اور پولیس کے لوگ خود گھبرا چکے تھے اور کام نہایت تیزی سے ہونے لگا تھا۔ انہوں نے نہایت عجلت کے ساتھ ہمارے کاغذات پر کچھ نشانات لگائے اور ہم کو جہاز پر سوار ہونے کی اجازت ملی۔

ہمارا سارا سامان اس دوران میں قلیوں کے رحم و کرم پر رہا۔ ہماری نشستیں چونکہ مخصوص تھیں اس وجہ سے ہمیں جگہ مل جانے کی توقع تھی اور یہ گمان بھی تھا کہ سامان بھی اپنی جگہ پر پہنچ گیا ہو گا لیکن جن بیچاروں کو ڈک پر کوئی جگہ حاصل کرنی تھی وہ جگہ حاصل کرنے کے لیے بھی پریشان رہے اور اپنے اپنے سامانوں کی طرف سے بھی غیر مطمئن رہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ نہایت پریشان ہوئے جو تنہا سفر کر رہے تھے اور جو نہ تو جہاز کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھے اور نہ اتنی طاقت و ہمت ہی رکھتے تھے کہ سارے جہاز میں پھر کر اپنا سامان تلاش کر سکیں۔

ایک بوڑھے آدمی کا سارا سامان جہاز میں دو تین روز تک گم رہا۔ بالآخر ہمارے

بعض رفیقوں نے اس کی مدد کی تو بڑی مشکلوں سے کہیں اس کا سامان دستیاب ہو سکا۔ یہی صورت حال نہ معلوم کتنوں کو پیش آئی ہو گی۔ اس صورت حال کے پیش آنے میں سب سے زیادہ دخل کسٹم' پولیس اور طبی معائنہ کے اس طریقہ کار کو ہے جو پورٹ پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا اکثر حصہ میرے نزدیک بالکل غیرضروری ہے۔ اگر اس کا کچھ حصہ ضروری ہے بھی تو اس کو سادہ اور آسان بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کارپردازوں کے اندر خدمت کا جذبہ ہو اور مقصود حاجیوں کو تنگ کرنا نہ ہو۔

سردھانا جہاز کے عرشے پر

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ہم سردھانا جہاز کی سیڑھیوں کے پاس پہنچے۔ جہاز باہر سے نہایت شاندار اور صاف ستھرا نظر آیا۔ یہ خیال کر کے کہ اب میرے اور اس جہاز کے درمیان سرکاری رسوم و ضوابط کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی ہے اور اب میں اس پر اپنے سب سے زیادہ محبوب و مطلوب سفر کے لیے سوار ہو سکتا ہوں' میرے دل کی خوشی کا جو حال ہوا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت میں اپنے رب کریم و کارساز کے لیے سراپا شکر و سپاس تھا۔ ابھی ہم جہاز کے نیچے ہی تھے کہ برادرم سلطان احمد صاحب جو کسٹم کی نفسانفسی میں ہم سے جدا ہو گئے تھے آ پہنچے۔ میں نے جہاز کے زینے پر قدم رکھنا چاہا تو میری بیوی نے متنبہ کیا کہ پہلے دہنا پاؤں رکھوں۔ میں نے اس نصیحت پر عمل کیا اور خیریت و سلامتی' حسن نیت اور توفیق عمل کی دعائیں مانگتے ہوئے زینے پر قدم رکھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اللہ اکبر! اس سفر کی کیا شان ہے کہ اس کے سبب سے انگریزی کمپنی کا یہ جہاز بھی اتنا مقدس بن گیا ہے کہ ہم اس پر سوار ہوتے وقت پہلے دہنا پاؤں رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

جہاز کے عرشے پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ہم نے اپنے کیبن میں پہنچ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ خدا کے فضل سے سارا سامان خیریت کے ساتھ اپنی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ برادرم سلطان احمد صاحب نے سامان کو قرینے کے ساتھ ترتیب دیا اور کیبن کے تمام

تضمنات اور تمام مضمرات سے ہمیں آگاہ کیا۔ ہم جہاز میں بالکل آخری وقت میں سوار ہوئے تھے اس وجہ سے تھوڑی ہی دیر کے اندر اس نے روانگی کی سیٹی دے دی۔ اب برادرم سلطان احمد صاحب کو ہم سے رخصت ہو کر جہاز سے اترنا تھا۔ انھوں نے پہلے تو مجھ سے چند پاکیزہ مقاصد کے لیے دعا کی خواہش کی' پھر گلے ملے اور اس وقت جذبات محبت سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ میں بھی ان کی محبت کے سیلاب میں بہ گیا۔ میں نے ان کو اور شاہدہ سلمہا کو مسنون دعا کے ساتھ رخصت کیا اور خود جہاز کے نئے ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو مانوس کرنے میں لگ گیا۔ یہ خیال نہیں ہوا کہ سلطان صاحب جہاز کے نیچے رخصت کرنے والوں کے ہجوم میں کھڑے رہیں گے۔ وہ صبح سے ہمارے ساتھ ہلکان ہوئے تھے' اس وجہ سے مجھے گمان ہوا کہ وہ فوراً گھر کو روانہ ہو جائیں گے' لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ جہاز کی روانگی تک برابر ہمیں رخصت کرنے کے لیے کھڑے رہے لیکن میں خود اپنے خیالات میں اس طرح ڈوب گیا کہ مجھے ساحل پر کھڑے رہنے والوں کا کچھ خیال نہ رہا۔ دراصل میں اس سفر کو اپنی اہلیت اور اپنے استحقاق سے اس قدر برتر خیال کرتا تھا کہ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا تھا اور میں اس لذیذ خواب سے بیدار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب جہاز روانہ ہوا اور ہم نے بسم اللہ مجریها و مرسٰها پڑھتے ہوئے کراچی کو الوداع کہا تب مجھے یقین ہوا کہ اب میں سفر حج پر روانہ ہو گیا ہوں۔ حج کی درخواست کے بعد سے لے کر اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل نے سچے اطمینان کی ٹھنڈک محسوس کی۔ اب تک مجھے طرح طرح کے اندیشے ستاتے رہے تھے کہ معلوم نہیں یہ لوگ میری راہ میں کس مرحلے میں کیا رکاوٹ ڈال دیں لیکن اب مجھے کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا' میں نے سوچا کہ اب زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہی تو کہ کہیں غرق ہو جائیں لیکن اب تو جہاں بھی غرق ہو جائیں ہمارے لیے وہی ساحل ہے۔ اس خیال سے میرے دل کا وہ سارا بوجھ بالکل اتر گیا جو اب تک کسی طرح بھی اتر نہیں سکا تھا۔

سردھانا جہاز نہایت صاف ستھرا جہاز ہے۔ حکومت پاکستان نے جو جہاز حاجیوں کے

لیے دوسری کمپنیوں سے کرائے پر حاصل کیے تھے' ان میں سب سے بہتر جہاز یہی تھا اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ حج کے کارپردازوں نے ہماری نشستیں اس جہاز میں مخصوص کیں۔ اس کے اوپر کے درجوں میں آسائش کے تمام لوازم موجود ہیں اور میرے جیسے شخص کے لیے تو یہ لوازم کیت اور کیفیت دونوں ہی اعتبار سے ضرورت سے زیادہ تھے۔ مگر یہ جہاز پاکستان کا ہوتا تو میں اس کے کارپردازوں کو یہ مشورہ دیتا کہ وہ ان لوازم میں کمی کر کے کرایہ میں تخفیف کر دیں' کیونکہ فی الواقع یہ لوازم بھی زیادہ تھے اور کرایہ بھی بہت زیادہ تھا۔

میں نے دوران سفر میں جہاز کے نچلے حصوں کو بھی پھر کر دیکھا۔ عرشے کے مسافروں کو جو ناشتہ اور کھانا ملتا تھا اس کا اندازہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ میں نے صفائی اور کھانے کے لحاظ سے عرشے کا انتظام بھی قابل اطمینان پایا البتہ یہ بات صاف محسوس ہوتی تھی کہ عرشے پر مسافر گنجائش سے زیادہ ہیں۔ عرشے کے بعض حصے نہایت تاریک تھے وہاں نہ روشنی کا گزر تھا نہ ہوا کا۔ ایسی جگہوں پر آدمیوں کا بھرا جانا تو درکنار' جانوروں کا بھرنا بھی کسی طرح جائز نہیں ہے۔ خود جہاز کمپنیوں کا فرض ہے کہ وہ عرشے کے ایسے حصوں کو مسافروں کے لیے استعمال نہ کریں لیکن ان کو اپنے کرائے سے مطلب ہوتا ہے اور ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس جہاز نہیں ہیں۔ اس وجہ سے کوئی ہمارے حاجیوں کو جہاں بھی لادے اور جس طرح بھی لادے ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ خصوصاً غریب حجاج کے معاملے میں تو ہمارے کار فرما حضرات اتنے بے پروا ہیں کہ انھوں نے ان کی ضروریات کے مسئلے پر انسان ہونے کے نقطہ نظر سے شاید غور کرنا ہی سرے سے چھوڑ رکھا ہے۔

دوسرے دن سے جہاز کے عرشے پر نماز باجماعت بھی ہونے لگی۔ اس کے اہتمام میں سب سے زیادہ حصہ تبلیغی جماعت کے بعض نوجوانوں کا تھا۔ انھوں نے جہاز کے عرشے پر قدم رکھتے ہی اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ تبلیغی دورے بھی ہونے لگے اور نمازوں کے اوقات میں تقریریں بھی ہونے لگیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تمام سرگرمیوں اور تقریروں میں علم سے زیادہ جذبے کا حصہ تھا لیکن ان لوگوں کا جذبہ نہایت

قابل قدر تھا۔ اس علم سے کیا فائدہ جس میں حرکت نہ ہو اور جس کے بوجھ کے نیچے فرض کا احساس دب کر رہ جائے۔ ان لوگوں نے عام عازمین حج کو حج کے احکام و آداب سکھائے اور جہاز کے سفر کے دوران میں بہتوں کو ان باتوں سے واقف کر دیا جن سے وہ واقف نہ تھے۔ ان لوگوں کی ہمت کی داد دیجیے کہ انھوں نے مجھ جیسے غیر متحرک آدمی کو بھی حرکت میں لانے کی کوشش کی' اگرچہ میں ان کی سرگرمیوں میں عملاً تو کوئی حصہ نہ لے سکا لیکن مجھے ان سے اور ان کی خدمات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ غور کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اگر وہ اپنے طریقہ کار میں تھوڑی سی تبدیلی اور اپنے زاویہ نگاہ میں تھوڑی سی اور وسعت پیدا کر لیں تو ان کے کام کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔ میں نے ارادہ کیا کہ کبھی مولانا محمد منظور نعمانی اور علی میاں سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بعض ضروری امور کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ میں نے ان لوگوں سے خود براہ راست بات چیت کرنے کی ہمت اس وجہ سے نہیں کی کہ شاید میرے خیالات ان لوگوں کو اپیل نہ کر سکیں۔

عازمین حج کے اس قافلے کو دیکھ کر یہ بات باربار میرے سامنے آئی کہ ہمارے ذہین طبقے کے اندر حج کی عظیم عبادت کا احساس بمنزلہ صفر ہے۔ یہ پورا قافلہ تمام تر عوام پر مشتمل تھا۔ اس کے اندر اس طبقے کا کوئی حصہ شامل نہیں تھا جس کو ہم ذہین طبقہ کہتے ہیں اور جس کے اندر کام کرنے کے اور جس کو جگانے اور بیدار کرنے کے ہم مدعی ہیں۔ ہمارے جہاز میں کم و بیش ڈیڑھ ہزار عازمین حج تھے لیکن ان میں پانچ آدمی بھی ایسے نہیں تھے جن کو ذہین طبقے کا نمائندہ کہا جا سکے۔ حج کی دینی اور دینی سے زیادہ سیاسی' اجتماعی اور ملی برکتوں پر بہت سے مقالے لکھے گئے ہیں اور ہم یہ گمان کر رہے تھے کہ ملک کے ذہین طبقے میں بڑا عظیم انقلاب آ گیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ انقلاب صرف انقلاب قیادت کے نعرے تک محدود رہا ہے۔ بندگان خدا کو حج کی طرف مائل کرنے میں اگر اس کا کوئی اثر ہے تو وہ معکوس ہے۔

جہاز پر ہمارے دن بڑے آرام سے گزرے' سمندر شروع سے آخری تک پرسکون

رہا۔ کسی کسی وقت اگر تھوڑی بہت حرکت جہاز میں ہوئی بھی تو اس سے صرف وہ لوگ متاثر ہوئے جن کے لیے جہاز کا سفر بجائے خود ایک بیماری ہے۔ عام طور پر لوگ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے رہے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی میں نے ہشاش بشاش پایا۔ اور اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جہاز کے ماحول میں بڑی یک سوئی اور بڑی یگانگت تھی۔ سب کی منزل ایک اور سب کا مقصد ایک' جہاز کے باہر یہ لوگ کتنے گروہوں' کتنی جماعتوں اور کتنے فرقوں میں بٹے رہے ہوں گے اور ان کے اغراض و مقاصد اور ان کے افکار و نظریات میں کیا کیا اختلافات رہے ہوں گے لیکن جہاز کے اندر یہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی عشق میں سرشار نظر آتے تھے۔ میں جس ذہنی خلفشار کو پیچھے چھوڑ کر گیا تھا اس کا ہر اثر میرے دل سے اس مبارک ماحول نے دھو دیا۔ میں نے اطمینان کی یہ گھڑیاں اپنے ذہن اور دماغ کو حج کے لیے تیار کرنے میں صرف کیں۔ میں نے اس دوران میں حج کے مقاصد و اسرار پر غور بھی کافی کیا اور جو چیزیں پڑھنے کے لیے ساتھ لے گیا تھا وہ چیزیں پڑھیں بھی۔ بحری سفر اگرچہ فضائی سفر کے مقابل میں بہت طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے چنانچہ میرے اس بحری سفر پر بعض دوستوں نے تعجب بھی کیا لیکن اس اعتبار سے یہ سفر بہت مفید معلوم ہوا کہ مجھے اس دوران میں اپنے ذہن اور اپنی طبیعت کو حج کے لیے تیار کرنے کا کافی موقع مل گیا۔ بعد میں جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس سال سعودی حکومت نے ہوائی جہازوں سے پاکستان کے عازمین حج کو سفر کی اجازت ہی نہیں دی تو بحری سفر کے معاملے میں مجھے اپنا یہ فیصلہ تائید غیبی کا مظہر معلوم ہوا اور میں نے اس پر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

احرام

انھی مشاغل کے اندر ہم اپنی میقات یعنی یلم لم کے قریب پہنچ گئے اور جہاز کے کارپردازوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ رات کے اتنے بجے ہم یلم لم کے سامنے سے گزریں گے۔ عازمین حج احرام کی تیاریاں کرلیں۔ یہ اعلان سن کر میرا

دل دھڑکنے لگ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی کا کوئی بہت ہی اہم موڑ سامنے آنے والا ہے۔ اس سے پہلے میرے دل میں بارہا یہ شوق پیدا ہوا تھا کہ کاش کبھی وہ دن آئے کہ میں احرام باندھے ہوئے "لبیک لبیک" کہتا ہوا جدہ کے ساحل پر اُتروں۔ احرام میں حنیفیت اور یکسوئی کی جو شان ہے' سب سے کٹ کر' ہجرت الی اللہ کی جو کیفیت ہے' زندگی اور زندگی کی لذتوں سے منہ موڑ کر فنا فی اللہ ہونے کی جو ادا ہے اور اسلام میں رہبانیت نہ ہونے کے باوجود' احرام میں تبتل' ترک دنیا اور فقر و درویشی کا جو جمال ہے' علاوہ ازیں تلبیہ کے پاکیزہ کلمات میں جو جذبہ' جو ولولہ' جو قدوسیت اور جو جوش و سرمستی ہے ان ساری چیزوں کا تصور میں اس سے پہلے بارہا کر چکا تھا اور حج کے زمانوں میں وارفتگی کی یہ صورت و ہیئت اپنے اوپر بھی طاری کرنے کی آرزوئیں میرے دل میں بارہا پیدا ہوئی تھیں' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ مبارک وقت آیا کہ میں احرام باندھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل ایک بہت بھاری بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ یہ بوجھ احرام کی پابندیوں کے احساس کا بوجھ ہرگز نہیں تھا۔ احرام میں پابندیاں ضرور ہیں لیکن یہ اس دین فطرت کا کمال ہے کہ اس نے اپنی عبادات میں ترک دنیا اور درویشی کی قسم کی کوئی چیز شامل بھی کی ہے تو وہ صرف اس حد تک ہے کہ وہ نفس کو خدا کی طرف موڑ تو سکے لیکن اس کو توڑ نہ سکے۔ اس وجہ سے میرے جیسے طالب العلم مزاج آدمی کو احرام کی ظاہری پابندیوں سے کیا گھبراہٹ ہو سکتی تھی؟ میرے لیے پریشانی کی چیز یہ سوال تھا کہ احرام کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ محض ظاہر کے لباس کو تبدیل کر لینے کا نام ہے یا یہ کسی باطنی تبدیلی کو بھی مستلزم ہے۔ مجھے یہ بات صاف نظر آئی کہ یہ ظاہر کی تبدیلی تو محض ایک نشان ہے۔ اس کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ آدمی کا باطن بھی تبدیل ہو جائے اور تلبیہ کے جو الفاظ زبان پر ہیں ان کی رُوح سے انسان کا دل سرشار ہو جائے۔

اس تبدیلی کی خواہش تو بہت پہلے سے میرے دل میں موجود تھی لیکن

جب فی الواقع اس تبدیلی کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ایک چیز کی خواہش کرنے اور اس کے کر گزرنے میں بڑا فرق ہے۔ خواہش اور عمل میں جو فاصلہ ہے وہ اس موقع پر مجھے نمایاں طور پر محسوس ہوا۔ مجنوں کی وارفتگیوں کی داستان سن سن کر اس پر واہ واہ کہنا اور چیز ہے اور خود مجنوں بن کر صحرا کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑے ہونا اور چیز ہے۔ میں نے اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی 'اے رب! تو مجھے اس تبدیلی کی ہمت دے' میں جس وقت اپنا پرانا لباس اتار کر تیرا پسندیدہ لباس پہنوں تو اسی کے ساتھ میرے دل پر چڑھا ہوا گناہوں کا غلاف بھی اتر جائے اور میرے ظاہر کی طرح میرے باطن کو بھی لباس تقویٰ کی زینت نصیب ہو۔'

اسی ذکر و فکر میں عصر کا وقت آگیا۔ اگرچہ یلم لم کی پہاڑی ابھی دور تھی لیکن میں نے غسل کر کے جماعت کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد احرام باندھ لیا۔ اس وقت میرے دل پر خوشی اور اضطراب کی دوگونہ کیفیات طاری تھیں۔ خوشی اس بات کی تھی کہ جس حج کی آرزو دل میں مدتوں سے پرورش پا رہی تھی، اس کی منزلوں میں سے پہلی منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔ اضطراب اس بات کے سبب سے تھا کہ مبادا اس جامہ احرام کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ احرام باندھتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میری اہلیہ نے اس موقع پر رو رو کر میرے لیے اور اپنے لیے دعائیں کیں۔

شام تک جہاز کے مسافروں کی اکثریت احرام کے لباس میں نظر آنے لگی اور مقصد کی یکسانی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لباس میں بھی یکسانی پیدا ہو گئی۔ صرف جہاز کے ملازمین اور وہ تھوڑے سے لوگ اس سے مستثنیٰ تھے جو جدہ سے سیدھے مدینہ منورہ کا قصد رکھتے تھے۔ جہاز کے گوشہ گوشہ سے تلبیہ کی صدائیں بھی بلند ہونے لگیں۔ خصوصاً نمازوں کے بعد تو یہ شور اتنا وجد انگیز ہوتا کہ میں سردھانا

جہاز کی ہر چیز بھول سکتا ہوں لیکن اُس چیز کو میرا حافظہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

معمولاً میں عشا کی نماز کے بعد سو جانے کا عادی ہوں لیکن اس رات میں اس وقت تک جاگتا رہا جب تک جہاز کے یلم لم سے آگے نکل جانے کا گمان نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں نے سونے کی کوشش کی لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ خیال ذہن میں غالب رہا کہ صبح جہاز جدہ پہنچنے والا ہے اور ہم سرزمین حجاز پر قدم رکھنے والے ہیں۔

جدہ میں

صبح بہت سویرے ہی سے میری نگاہوں نے جدہ کے ساحل کو ٹٹولنا شروع کر دیا لیکن یہ محض شوق کی جلدبازی اور بے صبری تھی' ساحل جدہ کے آثار کہیں نماز فجر کے بعد ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ تلبیہ اور مسنون دعاؤں کے ساتھ ہماری نگاہوں نے ان سے معانقہ کیا' اور ہم ایک ایک چیز کو محبت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھنے کے لیے جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو گئے۔

اس دوران میں یہ اعلان برابر ہوتا رہا کہ مسافر اپنا اپنا سامان جہاز پر چھوڑ کر صرف اپنے اپنے پاسپورٹ ہاتھوں میں لیے ہوئے اُتریں۔ سامان قلی اتاریں گے اور ان کو کوئی اُجرت نہیں دینی ہو گی۔ ہمارے وقت سے آٹھ بجتے بجتے جہاز ساحل پر لنگرانداز ہو گیا' سیڑھیاں لگ گئیں' پہلے قلیوں کے ہجوم نے جہاز کے اندر ہمارا استقبال کیا جو زیادہ تر یمنی معلوم ہوتے تھے۔ اُنھوں نے نہایت بگڑی ہوئی عربی زبان میں سامان اتارنے کے لیے مول بھاؤ شروع کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلیوں کے بے دام ہونے کی بات جس طرح کراچی میں جھوٹی تھی' اس سے زیادہ جدہ میں جھوٹی ہے۔ قلیوں کی قوم کراچی اور جدہ دونوں جگہ ایک ہی ملت سے تعلق رکھتی ہے۔ ان قلیوں نے سارے جہاز کا سامان ایک جگہ جمع کر کے کرینوں کے ذریعے سے ٹرکوں میں بھرنا شروع کر دیا اور یہ ٹرک کسٹم کو روانہ ہونے لگے' اسی طرح مسافروں کو بسوں میں بھر بھر کے کسٹم کے لیے روانہ کیا جانے لگا۔ آدمیوں کو بسوں میں سوار کرانے کا جو طریقہ تھا وہ تو مجھے پسند آیا۔ یکے بعد دیگرے ایک لاری جہاز کے زینہ کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ حد مقدار تک بھر جاتی تو روانہ ہو جاتی اور فوراً ہی دوسری اس کی جگہ لے لیتی لیکن اس اثنا میں میں

سامانوں پر بار بار غور کرتا رہا کہ ہزار ڈیڑھ ہزار مسافروں کا جو سامان ایک ساتھ ملا کر نہایت بے دردی کے ساتھ ٹرکوں میں بھر دیا گیا ہے وہ کسٹم میں لوگوں کو الگ الگ کس طرح مل سکے گا؟ لیکن حکومت کے اس انتظام میں میرے یا کسی کے دخل دینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں چپ چاپ کچھ دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ جب بس میں میرے سوار ہونے کی باری آئی تو میں بھی ایک بس میں بیٹھ کر کسٹم کے لیے روانہ ہو گیا۔ کراچی میں کسٹم کا جو تماشا میں نے دیکھا تھا اس کے سبب سے مجھے یہاں پریشان ہونا چاہیے تھا لیکن جب آدمی ایک مرتبہ یہ بات ذہن میں اچھی طرح بٹھا لے کہ اس راہ کی ساری تکلیفیں اور پریشانیاں بھی داخل عبادات ہیں تو پھر دل بہت مطمئن ہو جاتا ہے نہ آدمی کو سامان کی کچھ فکر رہ جاتی ہے' نہ جان کی....!

جدہ کے کسٹم میں

جدہ کے کسٹم میں داخل ہونے سے پہلے ہمارا پاسپورٹ دیکھا گیا اور اس پر اُسی طرح کی کارروائی عمل میں لائی گئی جس طرح کی کارروائی کراچی میں عمل میں لائی گئی تھی۔ لیکن سارا کام ایسی تیزی اور مستعدی سے ہو رہا تھا کہ کوئی زحمت محسوس نہیں ہوئی۔ دو قدم آگے بڑھے تو معلم کا نام پوچھا گیا۔ معلم کا نام بتاتے ہی ہمارے پاسپورٹ' ہمارے معلم کے ایجنٹ کے حوالے کر دیے گئے۔ اس کے بعد ہم اپنے سامان کے پاس پہنچا دیے گئے۔ مجھے خیال تھا کہ ہمیں اپنا سامان کم و بیش ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے سامان کے اندر سے چھانٹنا پڑے گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہیں رہی کہ ہمارا بیشتر سامان ایک ہی جگہ رکھا ہوا ملا۔ جائزے سے صرف بعض چیزیں غائب معلوم ہوئیں' لیکن رفقا نے تھوڑی سی جدوجہد سے وہ بھی دوسروں کے سامانوں سے برآمد کر لیں۔ اس کے بعد کسٹم والوں نے سامان کی تفتیش شروع کی لیکن یہ تفتیش محض رسمی تھی۔ اس میں کراچی والوں کی طرح ہراساں کرنے اور رشوتیں اینٹھنے کی کوئی خواہش کارفرما نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان لوگوں کو اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو وہ صرف لٹریچر

سے ہے۔ میرے پاس قرآن مجید اور حج سے متعلق چند رسالوں کے سوا اور کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ قرآن کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ چیز مجھے یہیں سے ملی ہے۔ اس جواب کے بعد انہیں میرے سامان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن ہمارے رفیق حکیم عبدالرحیم صاحب اشرف اپنے بکس میں لٹریچر کی قسم کی بہت سی چیزیں الم غلم بھر کے لے گئے تھے اس وجہ سے وہ بڑی دیر تک کسٹم والوں کے نرغے میں رہے۔ بالآخر یہ لوگ ان کے رسالے "المنیر" کے سارے پرچے اٹھا کر لے گئے اور واپسی تک بہت سی لکھا پڑھی کے باوجود واپس نہیں کیے۔

ان لوگوں کے لیے عربی کے سوا دوسری زبانوں سے ناواقفیت بڑی زحمت کا سبب ہے' لٹریچر کے معاملے میں یہ لوگ نہایت شکی بلکہ وہمی واقع ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ہر اخبار ہر رسالے اور کتاب سے ڈرتے ہیں کہ معلوم نہیں اس میں ملوکیت کے خلاف کیا مواد بھرا ہوا ہو۔ اپنے اس وہم میں بسااوقات یہ ترمذی کی شرح اور قرآن کی کسی تفسیر کو بھی باغیانہ لٹریچر سمجھ کر روک لیتے ہیں اور چونکہ ان چیزوں کو پڑھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کرنا مشکل ہوتا ہے اس وجہ سے بعض اوقات واپس کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ بعض دوستوں نے ان کے اس محکمہ احتساب کی نہایت دلچسپ حکایتیں سنائیں' جن کو سن کر آدمی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکتا لیکن سعودی حکومت کو ابھی ان چیزوں سے نیا نیا سابقہ پیش آیا ہے۔ اس وجہ سے یہ خامیاں ناگزیر ہیں۔ اب آہستہ آہستہ وہاں ہر چیز ترقی کر رہی ہے' توقع ہے کہ بہت جلد ساری چیزیں معیار پر آ جائیں گی۔ اگرچہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ ہر شعبے میں دفتریت کی تمام خصوصیات بھی داخل ہو جائیں گی جن سے سعودی حکومت ابھی تک خدا کے فضل سے محفوظ رہی ہے۔

ہمارا سارا سامان اسی طرح پھر ٹرکوں میں بھرا گیا جس طرح جہاز سے اتارتے وقت بھرا گیا تھا اور ہم بھی اسی طرح بسوں میں لادے گئے جس طرح جہاز سے اترتے وقت لادے گئے تھے اور وہاں سے جدہ کے مدینۃ الحجاج میں پہنچا دیے گے۔ یہاں پہنچ کر پھر

اپنے سامان کو ہزار ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے سامان سے علیحدہ کرنا تھا اگرچہ اس میں زحمت تو ہوئی لیکن سارا سامان مل گیا۔ سامان کے منتقل کرنے کا یہ طریقہ سہل اور سیدھا سادا تو ضرور ہے لیکن یہ ان لوگوں کے لیے خاصا پریشان کن ہے جو بچارے تنہا سفر کر رہے ہیں' انھیں اپنا سامان ڈھونڈنے کے لیے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ خود میری کئی چیزیں بڑی دیر تک گم رہیں جو رفقا نے بڑی محنتوں سے مدینۃ الحجاج کے مختلف کمروں سے برآمد کیں۔ اگر میں تنہا ہوتا تو میں تو ہمت ہار بیٹھتا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اپنے ہر سامان پر چوب قلم سے اپنے معلم کا نام لکھوا دینا کتنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر سامان کا ڈھونڈنا اور اس کا ملنا تقریباً ناممکن ہے۔

میں اس موقع پر اس انجمن کے ارکان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو حجاج کی خدمت کے لیے قائم ہے۔ یہ لوگ حجاج کو جہاز سے اتارنے اور ان کے سامان کو منتقل کرانے میں مدد کرتے ہیں۔ جدہ کے کسٹم سے نکلتے وقت ہمارا بڑا بڑا سامان تو قلیوں نے ٹرکوں میں بھر دیا لیکن چھوٹی چھوٹی چیزیں ایسی بھی تھیں جن کا ٹرکوں میں بھرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ چیزیں میں نے بس میں اپنے ساتھ رکھنی چاہیں لیکن یہ مختلف رفیقوں کی مل ملا کر تعداد میں اتنی ہو گئی تھیں کہ میں اور میری بیوی اپنے چار ہاتھوں میں ان کو کسی طرح بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ رفقا 'المنیر' کے پرچوں کے سبب سے کسٹم والوں سے الجھے ہوئے تھے۔ میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کروں' اتنے میں ایک بزرگ چند قلیوں کے ساتھ آئے اور انہوں نے مجھے ہڑبڑایا کہ جلدی سے بس میں سوار ہو جاؤں میں نے کہا کہ کس طرح سوار ہو جاؤں۔ میرے ساتھ متعدد چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں اور میرے ساتھی غائب ہیں۔ میں نے تو ان کو جواب عربی میں دیا لیکن وہ اردو میں بولے: "بابا! آپ چلو' یہ سامان ہم اپنے سر پر لائیں گے۔" ان کی یہ بات سن کر میں ایک متحیرانہ ذہنیت کے ساتھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس میں سوار ہو گیا——— میں مدینۃ الحجاج پہنچ کر ایک دیوار کے سائے میں ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ دیکھا کہ وہ بزرگ میری چیزیں لیے ہوئے' کچھ

خود اٹھائے ہوئے اور کچھ ان کے دوسرے ہمراہی اٹھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے کہ اچھا ہوا تم سامنے ہی مل گئے' تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور پھر ساری چیزیں میرے حوالے کر دیں۔

مدینۃ الحجاج

جدہ میں سعودی حکومت نے حجاج کے لیے جو مسافرخانہ بنوایا ہے اس کا نام مدینۃ الحجاج ہے اور یہ مسافرخانہ بجاطور پر اس نام کا مستحق ہے۔ کراچی کے حاجی کیمپ کی تکلیفیں جھیل کر جو پاکستانی جدہ کے مدینۃ الحجاج میں اترتا ہے وہ اپنے دل میں سخت شرمندہ ہوتا ہے کہ ہماری حکومت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت ہونے کے باوجود حجاج کے لیے وہ انتظام نہ کر سکی جو سعودی حکومت نے کر رکھا ہے۔ یہ مسافرخانہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں بیک وقت ہزاروں حاجی ٹھہر سکتے ہیں۔ اس کے کمرے نہایت کشادہ اور ہوادار ہیں۔ ہر کمرے میں بجلی کے پنکھے ہیں جو جدہ کی شدید گرمی میں بھی کمروں کو ٹھنڈا رکھتے ہیں۔ پانی اس میں اس قدر مہیا کیا گیا ہے کہ اس کے پانی کے انتظام کو دیکھ کر گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہم ایک ایسے ملک میں اُترے ہیں جہاں پانی کی کمی ہے' بیت الخلاؤں کی قطار کی قطار ہے۔ حاجی حضرات اپنے سوء استعمال سے ان کو گندا کرنے اور ناقابل استعمال بنا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن محکمہ صفائی ان کو صاف رکھنے کا پورا اہتمام کرتا ہے حالانکہ حجاز میں بھنگیوں یا مہتروں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اس کیمپ کے وسیع صحن میں ایک بارونق بازار بھی ہے جس میں ضرورت کی ساری چیزیں ملتی ہیں۔ ہم اس مسافرخانہ میں چند گھنٹے ٹھہرے' اس کی صاف ستھری مسجد میں ظہر' عصر اور مغرب کی نمازیں پڑھیں۔ اسی کے ایک ہوٹل سے کھانا منگوایا گیا اور یہ یہاں کے کسی ہوٹل کا بالکل پہلا تجربہ تھا۔ کھانے کی ہر چیز نہایت گراں بھی تھی اور ہمارے مذاق کے بالکل خلاف بھی۔ صرف چائے گزارے کے

قابل ایک چیز معلوم ہوئی' مگر اس میں بھی دودھ یا تو ڈبوں کا ملایا جاتا ہے یا بے دودھ کے پی جاتی ہے۔

کراچی کی خواتین

مدینۃ الحجاج میں ایک واقعہ قومی اور اسلامی دونوں نقطہ ہائے نظر سے میرے لیے وجہ شرمندگی ہوا۔ میں مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کر لوٹ رہا تھا کہ چند بنی ٹھنی بے پردہ لڑکیاں مدینۃ الحجاج کے بازار میں سیر کرتی نظر پڑیں۔ میں نے ان کے لباس اور انداز سے قیاس کیا کہ ہو نہ ہو یہ آفت کراچی یا لاہور سے نازل ہوئی ہے۔ حجاز کے کسی شہر میں عورتوں کا اس طرح بن سنور کر بے حجابانہ نکلنا تصور سے ایک مافوق شے ہے۔ عورتیں احرام کی حالت میں چہرے ضرور کھلے رکھتی ہیں بلکہ مصر و شام وغیرہ کی عورتیں بے پردہ بھی پھرتی ہیں لیکن ان کے طریقے اور ہوتے ہیں۔ ان لڑکیوں کے انداز میں اتنی بے باکی تھی کہ انھوں نے فوراً ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ عربوں کی ایک ٹولی ایک قہوہ خانے کے سامنے بیٹھی ہوئی قہوہ پی رہی تھی۔ پہلے تو یہ لوگ ان کو دیکھ کر ایک طنزآمیز ہنسی ہنسے پھر انھوں نے ان سے پوچھنا شروع کیا کہ تم کہاں سے آئی ہو؟ سوال عربی میں تھا' اس وجہ سے لڑکیاں جواب دینے کے بجائے کچھ جزبز سی ہوئیں۔ پھر ایک شخص نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا کہ "تم کس ملک سے آئی ہو؟" ایک لڑکی نے کھسیانی ہو کر جواب دیا کہ "کراچی سے!" یہ جواب اگرچہ میری توقع کے خلاف نہ تھا تاہم مجھے اس پر سخت غصہ بھی آیا اور سخت شرمندگی بھی ہوئی لیکن اِنا لِلّٰہ پڑھنے کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا۔ میں اس کے بعد بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ آخر ان نیک بیبیوں نے حج کے سفر کی زحمت کیوں اٹھائی اگر محض بے حجابی کی نمائش مقصود تھی تو اس کے لیے کلفٹن یا مال روڈ کافی تھے اور اگر ان پر قناعت ممکن نہ تھی تو پھر جدہ سے کہیں آگے کے لیے رخت سفر باندھنا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ حجاز میں عورتیں سخت پردہ کرتی ہیں اور سنا ہے کہ حج کے زمانے میں ان کو اس پردے کے مزید اہتمام کی حکومت کی طرف سے تاکید کی جاتی

ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حجاز کی عورتیں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ قومی غیرت کے نقطہ نظر سے بھی پردے کو اہمیت دیتی ہیں لیکن ہم پر افسوس ہے کہ نہ ہمارے اندر اسلامی حمیت ہی ہے اور نہ قومی غیرت ہی۔

جدہ سے مکہ معظمہ

ہم جس دن جدہ میں اترے ہمارے معلم کے وکیل نے اسی دن ہمیں مکہ معظمہ بھیجنے کا سامان کر دیا۔ ہمیں اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔ منزل مقصود سے اس قدر قریب ہو جانے کے بعد یہ تھوڑی سی دوری جو باقی رہ گئی تھی ہماری طبیعتوں پر بڑی شاق تھی۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہم اڑ کر مکہ معظمہ پہنچ جائیں اور بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ کی سعادت حاصل کریں۔ اڑ کر پہنچنا اگلے زمانوں میں تو محض ایک استعارہ تھا لیکن اب تو سائنس کی ترقیوں نے اس کو ایک حقیقت بنا دیا ہے۔

ہمارے اضطراب کو دیکھ کر ہمارے معلم کے وکیل نے ہمیں بتایا کہ تاخیر جو کچھ ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ ابھی آپ لوگوں کا پاسپورٹ پاکستانی سفارت خانے سے واپس نہیں آیا ہے۔ اس کے واپس آتے ہی آپ روانہ کر دیے جائیں گے۔ اسی اثنا میں مجھے پاکستانی سفارت خانے کے ایک کارکن ملے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔ میں نے کہا ہمارے پاسپورٹ جلدی بھجوایئے' ہم بلا تاخیر مکہ معظمہ پہنچنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بشارت سنائی کہ پاسپورٹ معلم کے پاس واپس آ گئے ہیں۔ اپنے سفارت خانے کی اس مستعدی سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ سامان کا جھگڑا نہ ہوتا تو شاید ہم ٹیکسی سے فوراً ہی روانہ ہو جاتے لیکن سامان کی مجبوری کے سبب سے مناسب معلوم ہوا کہ لاری سے چلیں۔

حجاز میں دھوپ اور گرمی کی شدت کے سبب سے سارا سفر رات میں ہوتا ہے۔ عموماً بسیں اپنے مرکزوں سے عصر اور مغرب کے درمیان چلتی ہیں اور ٹھنڈے ٹھنڈے منزل مقصود پر پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہوتا ہے تو آفتاب کی تمازت بڑھنے

ہی کسی موزوں مقام پر ڈیرے ڈال دیتی ہیں۔ جدہ سے بھی حاجیوں کی لاریاں عموماً عصر اور مغرب کے درمیان ہی روانہ ہوتی ہیں۔ حاجیوں کا سامان عموماً زیادہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا لادنا بھی ایک مشکل کام ہوتا ہے' اس کام کو جس غیر معمولی قابلیت اور مہارت کے ساتھ حجاز کی بسوں والے انجام دیتے ہیں شاید ہی کہیں کے ڈرائیور اس قابلیت اور مہارت کا ثبوت دے سکیں۔ ہماری بس کے تیار ہونے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اس وجہ سے ہم مغرب کی نماز پڑھ کر جدہ سے روانہ ہو سکے۔ بس میں بیٹھتے وقت ایک چھوٹے سے واقعہ سے مجھے عرب قوم کے عام مزاج کا اندازہ ہوا۔ میری اہلیہ نے جب بس کے اندر داخل ہونا چاہا تو پاکستان کے عام قاعدہ کے مطابق ایک دو حاجی صاحبان نے سبقت کرنے کی کوشش کی لیکن کنڈکٹر نے "حرمہ۔ حرمہ" کہتے ہوئے ان کو سختی سے روکا اور جب تک میری اہلیہ اپنی نشست پر بیٹھ نہیں گئیں' اس نے ان حضرات کی جلد بازی کے باوجود ان کو اندر داخل ہونے نہیں دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ عرب کے لوگوں میں جنس ضعیف کے لیے ہمدردی اور احترام کی قدیم روایت اب بھی باقی ہے۔

مغرب کے بعد تکبیر و تلبیہ کی گونج کے ساتھ گاڑی جدہ سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئی اور ضابطہ کی چند کارروائیوں کے بعد' جن میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی' گاڑی شہر کے حدود سے باہر ہو گئی۔

شہر کے حدود سے نکلتے ہی ڈرائیور نے بخشش کا مطالبہ پیش کر دیا اور یہ مطالبہ اس دھمکی کی ساتھ پیش کیا کہ اگر ہم نے بخشش نہ دی تو وہ گاڑی کو راستہ میں کہیں روک کر سو جائے گا اور اس بات کی اس کو کوئی پروا نہ ہو گی کہ ہم مکہ معظمہ کب پہنچیں گے۔ ہم دل میں یہ ارمان لیے بیٹھے تھے کہ عشا کی نماز ہم حرم میں پڑھیں گے لیکن اس دھمکی کے بعد عشا تو در کنار فجر کی نماز بھی حرم میں پڑھنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ حجاز میں حاجیوں کا کرایہ ہی اول تو عام مسافروں کی نسبت سے کئی گنا ہے۔ پھر یہ قدم قدم پر "بخشیش" کی مار ان کے لیے مزید برآں ہے لیکن اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت حجاز اس صورت حال سے باخبر بھی ہے اور وہ اس کی

اصلاح بھی کرنا چاہتی ہو گی لیکن غالباً ایک لاعلاج مرض ہے یا کم از کم قانون اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ راستے میں اگر ڈرائیور لاری کا انجن بگاڑ کر کہیں دھوپ میں مسافروں کو ڈال دے تو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اگر پولیس بازپرس کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ انجن خراب ہو گیا' میں کیا کروں۔ اس وجہ سے حاجی بیچارے اسی میں سلامتی سمجھتے ہیں کہ ڈرائیور کا مطالبہ پورا کر کے اپنے آپ کو خراب ہونے سے بچائیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی میں سلامتی سمجھی کہ اس کا مطالبہ پورا کر دیا جائے اور جلدی سے جلدی منزل مقصود پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے تمام مسافروں سے "بخشیش" وصول کر کے جب ڈرائیور کے حوالے کی اور اس نے قبول کر کے اپنے جیب میں ڈال لی تب اس کی دھمکی کا خوف ہمارے دلوں سے دور ہوا۔

اس خرابی کی اصلاح خواہ کتنی ہی مشکل ہو لیکن اس کی اصلاح ہونا ضروری ہے۔ سعودی حکومت کا فرض ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کی اصلاح کرے۔ قانون کے ذریعے سے اس کی اصلاح کرے یا اس کے لیے عرب قوم کے اسلامی اور قومی ضمیر کو جگائے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں کے لوگ اپنے ملک کے باہر سے آنے والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرتے ہوں۔ پھر یہاں تو معاملہ صرف باہر سے آنے والوں ہی کا نہیں بلکہ ضیوف اللہ کا ہے جن کے بارے میں قرآن اور حدیث میں اہل مکہ پر بہت سی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ حاجیوں کو آمدنی کا ذریعہ سمجھنے کا قدیم ذہن عام تعلیم و تربیت کے ذریعے سے بدلا جائے۔ اور عرب کے اسلامی احساس کو ابھارا جائے۔ سعودی حکومت کے محکمہ امر بالمعروف و النہی عن المنکر کو اس منکر کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔

اپنی "بخشیش" کی طرف سے مطمئن ہو چکنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی پوری رفتار سے چلائی۔ یہاں کے ڈرائیور گاڑیاں بہت تیز رفتار سے چلانے کے عادی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اونٹ کے بعد ان کو جو موٹریں مل گئی ہیں تو اونٹ کی سست رفتاری کا انتقام وہ موٹروں سے لینا چاہتے ہیں۔ گاڑیاں عموماً بہت اچھی ہیں اور سواریاں کسی

صورت میں بھی حد مقدار سے زیادہ نہیں ہونے پاتیں۔ راستے میں بار بار مختلف تھانوں پر جانچ ہوتی رہتی ہے۔

عرب کے ڈرائیور ہمارے ملک کے ڈرائیوروں کی طرح خاموشی کے ساتھ گاڑی چلانے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے یا تو اپنے ساتھی کے ساتھ پورے جوش و خروش کے ساتھ گفتگو کرتے رہتے ہیں یا پھر مسلسل گاتے رہتے ہیں۔ اونٹوں کے عہد کی حدی خوانی کی قدیم روایت موٹروں اور لاریوں کے اس عہد میں بھی باقی ہے اور اب تو بہت سی گاڑیوں میں ریڈیو سیٹ بھی لگے ہوئے ہیں۔ اگر ڈرائیور خود نہیں گانا چاہتے تو مصری اور شامی مغنیات کے گانے سننے کے لیے ان کو کھول لیتے ہیں۔ بعض مرتبہ ہمیں بھی ان گانوں کے سننے پر مجبور ہونا پڑا۔ جن عاہرات کے گانے ہم نے اپنے ملک میں کبھی نہیں سنے تھے سفرِ حج کے موقعہ پر ان کے سننے پر ہم مجبور ہوئے۔

جدہ سے مکہ کا یہ سفر رات میں ہوا۔ اس وجہ سے اس دیار کی ایک ایک چیز کو دیکھنے کا جو شوق ہمارے دلوں میں تھا وہ پورا نہ کر سکے۔ صرف دہنے بائیں کی پہاڑیوں اور ریگستانوں کا کچھ اندازہ ہوتا تھا لیکن اس سے ہمارے ذوق و شوق کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ راستے میں ایک قہوہ خانہ کے پاس ڈرائیور نے بس روکی۔ ہم عشا کی نماز حرم میں پڑھنا چاہتے تھے لیکن یہاں ہم نے محسوس کیا کہ مکہ معظمہ پہنچتے پہنچتے دیر ہو جائے گی اس وجہ سے ہم نے ایک چھوٹی سی زیر تعمیر مسجد میں عشا کی نماز پڑھی۔ اس وقت صحرا کی فضا بڑی ہی پرسکون اور ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ ہم احرام کے ہلکے پھلکے لباس میں بڑی خوشی اور بڑی آزادی محسوس کر رہے تھے۔ نماز کے بعد ہم نے بتے والی اونچی اونچی چارپائیوں پر بیٹھ کر چائے پی اور چائے پینے کے بعد تکبیر و تلبیہ پڑھتے ہوئے آگے کی منزل کی لیے چل پڑے۔

مکہ معظمہ کے قریب ڈرائیور نے ایک بار پھر ہاتھ پاؤں پھیلائے کہ ہم کچھ دینے پر راضی ہوں لیکن حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اس کو ڈانٹ پلائی کہ اگر تم راستے ہی میں رات گزارنا چاہتے ہو تو شوق سے گزارو لیکن ہم تمہیں اب دینے دلانے کے کچھ

بھی نہیں۔ حکیم صاحب کے اس رویے نے اس کو مایوس کر دیا اور وہ تھوڑی دیر تک انجن کے ساتھ چھیڑچھاڑ کرنے کے بعد آگے کے لیے چل پڑا۔

مکہ معظمہ میں داخلہ

راستہ بھر ہماری زبانیں تو تکبیر و تلبیہ اور ذکر و دعا میں مشغول رہیں لیکن ہماری نگاہیں بلدامین کے آثار و عمارات کی تلاش میں رہیں۔ راستے میں جہاں کہیں شبہ ہو جاتا کہ سرزمین پاک کی کوئی عمارت آگئی ہے تو ہماری لبیک لبیک کی صدائیں زیادہ بلند ہو جاتیں۔ بالآخر پولیس کی چوکی آئی اور اس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ اب ہم دنیا کے سب سے زیادہ مبارک شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس وقت سے برابر دل کے ریشے ریشے سے دعا نکلتی رہی کہ رب کریم اس شہر کی رحمتوں اور برکتوں میں سے ہمیں بھرپور حصہ دے اور اس میں ہمارا داخل ہونا اور اس سے ہمارا نکلنا دونوں' اس کی رضا کے مطابق ہو۔ راستے میں جو عمارات آتیں ان میں سے جو نئے طرز پر بنی ہوئی ہوتیں ان سے تو مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی لیکن پرانے طرز کا کوئی مکان اگر نظر آ جاتا تو میرا دل چاہتا کہ بس یہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑی ہو جائے تاکہ میں اس کو غور سے دیکھ سکوں۔ ممکن ہے اس کے کسی پتھر پر اس عہد کہن کا کوئی نقش موجود ہو' جس کی یاد اور جس کی محبت ہمیں یہاں کشاں کشاں لائی ہے۔

اسی ذکر و فکر میں منہمک بعض کشادہ سڑکوں اور بعض تنگ راستوں سے گزرتے رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ بس ہمیں کسی اڈے پر اتارے گی اور وہاں سے ہمیں اپنے معلم کے مکان تک پہنچنے کے لیے خود کوئی انتظام کرنا پڑے گا لیکن جن جن معلموں کے حاجی ہماری بس میں سوار تھے ان کے آدمی پہلے ہی سے بس میں سوار ہو گئے اور انھوں نے اپنے اپنے آدمیوں کو اپنے اپنے ڈیروں پر اتارنا شروع کیا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ بس ہمیں بھی ہمارے معلم کے مکان پر اتارے گی۔ اس بات سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ اس انتظام نے رات میں معلم کے مکان کی تلاش کی زحمت سے ہمیں بچا لیا ورنہ ہمیں

اپنے سارے سامان کے ساتھ معلم کے مکان کی تلاش میں بہت خراب ہونا پڑتا۔ حجاج کے لیے یہی وہ چند آسانیاں ہیں جن سے اس زائد کرائے کی کچھ تلافی ہو جاتی ہے جو عام مسافروں کے مقابلے میں حجاج سے وصول کیا جاتا ہے۔

ہم جس وقت اپنے معلم کے دروازے پر پہنچے ان کے دونوں صاحبزادوں اور ان کے آدمیوں نے ہمارا خیرمقدم کیا۔ فوراً ہمارا سامان اتارا اور اپنے مکان میں لے گئے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ معلمی کا نظام اپنی تمام خرابیوں کے باوجود حجاج کے لیے بہت سی سہولتیں بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ نظام نہ ہوتا تو ہم ایک بالکل اجنبی جگہ میں اس وقت کتنی مشکلوں میں گرفتار ہوتے۔

عمرہ

ہم نے اترتے ہی معلم صاحب کے صاحبزادے سے جو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان ہیں' کہا کہ ہم بلاتاخیر عمرہ سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنا ایک آدمی ہمارے ساتھ کر دیا اور ہم اس کی رہنمائی میں حرم کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمارے وقت سے کوئی رات کے دو بجے کا وقت ہو گا۔ معلم صاحب کا آدمی غالباً بستر سے اٹھا کر اس خدمت کے لیے لایا گیا ہو گا۔ اس وجہ سے اس کو جمائیاں آ رہی تھیں۔ یوں بھی وہ بے چارہ اس کام کے لیے مجھے کچھ غیرثقہ سا معلوم ہوا۔ وہ رٹی ہوئی دعائیں بلند آواز سے پڑھتا ہوا بلکہ ہمیں پڑھاتا ہوا آگے آگے چلا اور ہم ان دعاؤں کو دہراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ وہ غریب دعائیں بھی غلط پڑھتا تھا۔ اس وجہ سے مجھے ناگواری کا احساس ہوا اور اس ناگواری نے اس کیفیت میں بڑا خلل پیدا کر دیا جو اس خاص وقت اور اس حالت میں عین حرم کے دروازوں پر ہم محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ہم ابھی نووارد تھے اور تمام راستوں اور مقامات سے ناواقف' اس وجہ سے ناگواری کے باوجود اسی رہنما کی رہنمائی میں ہمیں تمام مناسک ادا کرنے تھے۔ ہم نے دل میں خیال کیا کہ ایک مرتبہ کے بعد ہم ہر چیز سے خود واقف ہو جائیں گے' پھر ہمیں ان معلم حضرات اور ان کے ان

شاگردوں کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ اس دن کے بعد پھر ہمیں اس طرح کے کسی کام کے لیے ان حضرات میں سے کسی کا ممنون احسان ہونا نہیں پڑا۔

ہم باب ابراہیم کے پاس سے اس سڑک سے ہوتے ہوئے جو قدیم حرم اور جدید حرم کے درمیان سے گزرتی ہے باب السلام پہنچے اور اس سے مسنون دعا پڑھتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے۔ جس وقت بیت اللہ کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوئی ہیں اس وقت میرے دل کی جو کیفیت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ مجھ پر خانہ کعبہ کی عظمت کا ایسا رعب طاری ہوا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے پاؤں بے سکت ہو رہے ہیں اور میں لڑکھڑا کر گر پڑوں گا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے سنبھال لیا۔ پھر جتنے ہی قریب ہوتا گیا یہ دہشت انس اور محبت سے تبدیل ہوتی گئی۔ بیت اللہ کے دروازے کے پاس پہنچتے پہنچتے دل اگرچہ بہت بڑی حد تک مطمئن ہو گیا لیکن پھر بھی میں اس وقت بہت سی پڑھی اور سیکھی ہوئی چیزوں کو مستحضر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس وجہ سے اس وقت وہی رہنما بس غنیمت معلوم ہوا جو نیم بیداری اور نیم خواب کی حالت میں ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔

جس وقت ہم طواف کے ارادے سے مطاف میں داخل ہوئے ہیں' طواف کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی اس وجہ سے بڑی آسانی کے ساتھ ہمیں حجراسود کے پاس پہنچنے اور اس کو بوسہ دینے کا موقع مل گیا۔ پولیس کا جو آدمی ڈیوٹی پر تھا اس نے بھی ہمارے احرام کے کپڑوں سے معلوم کر لیا کہ ہم نووارد ہیں اس وجہ سے اس نے ہمارے ذوق و شوق کا کچھ لحاظ کیا اور اپنے امکان کے حد تک ہمارے لیے سہولت بہم پہنچائی۔ میری بیوی کو بھی بڑے اطمینان سے حجراسود پر حاضری کا موقع مل گیا۔ اس پہلی کامیابی سے بڑی خوشی اور بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

حجراسود کو یمین اللہ (اللہ تعالیٰ کا ہاتھ) کہا گیا ہے اور یہ بوسہ دینا یا ہاتھ لگانا یا اشارہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہدبندگی کی تجدید ہے۔ حجراسود کی طرف مسنون دعا پڑھتے ہوئے جب میں بڑھا ہوں اور مجھے یہ خیال آیا کہ اللہ اکبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے لے کر اب تک کیسے کیسے لوگوں نے اس پتھر کے سامنے تجدید بیعت کی ہے'

اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کے عہد میں شامل ہوئے ہیں' اور پھر میں نے یہ دیکھا کہ آج یہ سعادت مجھ جیسے گناہ گار کو بھی حاصل ہو رہی ہے تو میرے دل کو جو خوشی حاصل ہوئی اس قسم کی خوشی کا مجھے یہ بالکل پہلا تجربہ تھا۔ طواف کے تمام پھیروں میں یہ خوشی مجھ پر طاری رہی اور اس دوران میں جتنی دعائیں میں نے پڑھیں یا مجھے پڑھائی گئیں ان کا لفظ لفظ صرف زبان سے نہیں' بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ دل سے نکل رہا ہے۔

طواف سے فارغ ہونے کے بعد ہم میں سے ہر ایک کو مقام ابراہیم میں دو دو رکعتیں ادا کرنے کا بھی بغیر کسی مزاحمت کے موقع مل گیا۔ میری اہلیہ کو بھی بالکل اس کے پاس ہی جگہ مل گئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم زم زم کے پاس پہنچے۔ وہاں بھی ہجوم نہیں تھا۔ پانی پینے کے بعد پلانے والے صاحب نے پانی کا ایک پورا ڈونگا میرے سر پر ڈال دیا۔ ان کی اس دریادلی پر دل سے دعائیں نکلیں اور زم زم سے بھیگی ہوئی احرام کی چادروں میں صرف جسم ہی نے نہیں بلکہ رُوح اور دل نے بھی طراوت محسوس کی۔

یہاں سے ہم صفا و مروہ کی سعی کے لیے صفا کی طرف روانہ ہوئے۔ دل اس قدر خوش تھا کہ سفر کی تکان کا احساس تو درکنار سرے سے سفر ہی کا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اس دوران میں اگر کسی چیز سے تھوڑی سی کلفت ہوئی ہے تو وہ دو واقعات ہے۔

ایک واقعہ تو یہ ہے کہ ایک سائل صاحب نے بخشیش کا مطالبہ کیا۔ میں نے مطالبہ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ان کا انداز سوال کا نہیں بلکہ مطالبے ہی کا تھا۔ پیسے میرے ساتھیوں کے پاس تھے اور وہ سب کے مطالبات پورے کرتے ہوئے آگے بڑھ چکے تھے۔ میں نے معذرت کی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ فقیر ہو۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں کیا شبہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اردو زبان میں ایک موٹی سی گالی نکالی۔ ان کی زبان سے عین حرم میں ایک نہایت مکروہ لفظ سن کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی لیکن میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اول تو یہ بیچارے اردو کے اس طرح کے الفاظ کے معنی مطلب سے کہاں واقف ہوں گے' کہیں سے سن رکھے ہوں گے' جی میں آگیا ہو گا کہ جب ترکش میں ایک تیر موجود ہے تو پڑا کیوں رہے۔ استعمال

کیوں نہ کر ڈالوں۔ ثانیاً یہ حضرات شب و روز اسی حرم میں گزارتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس کی وہ عظمت کہاں ہو سکتی ہے جو ان کے دلوں میں ہو سکتی ہے جو کہیں زندگی میں ایک بار مشکل سے اس کی زیارت کی سعادت حاصل کر پاتے ہیں۔

دوسرا واقعہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے۔ چند قدم آگے بڑھے تو ایک نوجوان نے جو یمنی معلوم ہوتا تھا' ہمارے معلم کی نقل اتارنی شروع کر دی۔ معلوم ہوتا ہے ان دونوں میں دوستی اور بے تکلفی تھی۔ اس دوستی اور بے تکلفی کا فائدہ یمنی صاحب نے یہ اٹھایا کہ معلم کے دعائیں پڑھنے کے انداز اور اس کی شان معلمی کا عین حرم میں مذاق اڑانا شروع کر دیا اور وہ بھی اس کے زیر ہدایت حاجیوں کے سامنے۔ معلم بیچارے نے جب یہ دیکھا کہ اس کا سارا بھرم خطرے میں ہے تو اس نے یمنی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے حاجی عربی جانتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ایسی حرکت نہ کرے لیکن اس تنبیہ کے باوجود بھی یمنی صاحب باز نہ آئے اور نہایت بھونڈے طریقے سے اس غریب کا مذاق اڑاتے رہے۔

یہ واقعہ بھی ہمارے لیے خاصہ تکلیف دہ رہا۔ جو لوگ عقیدت کے جذبات کے ساتھ حج کے لیے آتے ہیں۔ جب وہ عین حرم کے اندر اہل حرم کے ہاتھوں حرم اور اس کے شعائر کی یہ بے حرمتی دیکھتے ہیں تو وہ سرے سے حج ہی سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے واقعات سے اس قسم کا تاثر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ آخر شیطان کہاں نہیں ہے۔ کسی حبشی یا یمنی کی جہالت سے متاثر ہو کر آدمی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بنائے ہوئے گھر اور اس کی برکتوں سے کیوں بدگمان ہو جائے؟ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس قسم کے لوگ معلمی کے فرائض انجام دیتے ہیں ان کو دیکھ کر دل پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ ان میں وقار' سنجیدگی اور دین داری کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہوتا بالخصوص معلموں کا شاگرد پیشہ طبقہ تو تعلیم و تربیت اور علم و اخلاق کے نقطہ نظر سے اتنا پست ہے کہ ہر آدمی ان کا مذاق اڑانے کی جرات کر سکتا ہے۔

ہم انہی تکلیف دہ احساسات کے ساتھ مسعیٰ میں داخل ہوئے۔ مسعیٰ کو دیکھ کر میری

حیرت کی کوئی حد نہیں رہی۔ اب تک جو چیزیں نگاہ کے سامنے آئی تھیں وہ بڑی حد تک اس اندازے کے مطابق تھیں جو میں ان کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا تھا' لیکن سعی کی جگہ کے بارے میں میرے سارے اندازے سوفیصدی غلط نکلے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عام روایت کے مطابق حضرت ہاجرہ علیہما السلام نے پانی کی تلاش میں تگ و دو فرمائی ہے۔ بعض اہل نظر کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرزند کی قربانی کے وقت اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں جو سعی اور سرگرمی دکھائی ہے' یہ اس کی جگہ ہے۔ ان میں سے جو بات بھی صحیح ہو بہرحال آدمی یہاں پہنچنے سے پہلے یہ توقع کرتا ہے کہ دو پہاڑیوں کے درمیان کوئی کھردری اور ناہموار جگہ ہو گی جہاں اس کو سعی کرنی ہو گی۔ میرے ذہن میں کچھ اسی طرح کا تصور تھا اس وجہ سے میں مسعیٰ میں پہنچ کر بھی یہی سمجھتا رہا کہ مسعیٰ کوئی اور ہے۔ میں اس پرشکوہ تعمیر کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ دورویہ عظیم الشان محرابوں پر قائم ایک دو منزلہ عمارت ہے جو اس پورے رقبے پر چھائی ہوئی ہے جو سعی کے لیے مخصوص ہے۔ یہ عمارت اتنی مستحکم' اتنی پرشکوہ اور اتنی لمبی ہے کہ آدمی یہاں حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ علیہما السلام کی ہجرت و غربت کے تصور کے بجائے اس عمارت کے بنانے والوں اور اس کے بنوانے والوں کے کمال تعمیر اور وسائل تعمیر کی بھول بھلیاں میں گم ہو جاتا ہے۔ سعی کرتے وقت میرے ذہن میں باربار یہ بات آئی کہ آخر ہم یہاں حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل حضرت ہاجرہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نقوش کی تلاش میں آتے ہیں یا آرٹ اور صنعت کے یہ کمالات دیکھنے آتے ہیں؟ ایک دو پھیرے تک تو میرا ذہن کچھ اسی طرح کی الجھنوں میں رہا لیکن پھر دفعتاً میرے حافظے میں اس مقام کی عظیم الشان تاریخ جاگ اٹھی اور میں نے اس کے حاضر سے نگاہیں ہٹا کر اس کے ماضی کی طرف مرکوز کر دیں اس سے میرے دل کی کیفیت الحمدللہ بدل گئی۔

بعد میں میں نے بعض دوستوں سے اپنے اس احساس کا ذکر کیا اور ساتھ ہی ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پڑھا ۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

انھوں نے میرے اس احساس کی تو تائید کی لیکن ساتھ ہی اس خراب حالت کا نقشہ کھینچا جو اس تبدیلی سے پہلے مسعیٰ کی تھی تو میں نے تسلیم کرلیا کہ اگر یہ حالات تھے تو پھر تو یہ تبدیلی ضروری تھی۔

سعی سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے حجامت بنوانی چاہی اس کے لیے ہمارا رہنما ہمیں مسعیٰ کے پیچھے ایک سیلون میں لے گیا۔ اگرچہ شب کا بالکل آخری حصہ تھا لیکن اس وقت بھی حجامت بنوانے والوں کی اتنی تعداد موجود تھی کہ ہمیں اپنی باری کے لیے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ حجامت بنوانے والے تمام تر وہ لوگ تھے جو اب عمرے سے فارغ ہو رہے تھے۔

عمرے کے سلسلے کی آخری چیز یہ حجامت ہے۔ یہ حجامت اظہار بندگی اور اپنے آپ کو اللہ کے لیے نذر کر دینے کی ایک خاص نشانی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی نذر کیا جائے خاص شرط یہ تھی کہ اس کو سات مرتبہ مذبح کے سامنے پھیرا جائے اور اس کے سر پر استرہ نہ چلا ہو' صرف مذبح کے سامنے اس کا سر مونڈا جائے۔ اسلام میں بھی اس کی یادگار موجود ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے۔ منیٰ تک اس کی وسعت تو امت کی وسعت کے اعتبار سے ہوئی ہے۔

حجامت سے متعلق امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کے مشورے کے مطابق میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ عمرے کے موقع پر بال کم کرا دوں گا۔ اور حج کے موقع پر سر منڈا دوں گا تاکہ مجھے حلق اور تقصیر دونوں کا ثواب حاصل ہو سکے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بس ایک ترمیم اس میں کی وہ یہ کہ مدینہ منورہ سے واپسی کے موقع پر ایک عمرے کی سعادت ہمیں اور حاصل ہو گئی تو میں نے یہ کیا کہ پہلے عمرے کے موقع پر بال قینچی سے کم کرا دیے۔ دوسرے عمرے کی موقع پر مشین سے ترشوا دیے اور حج کے موقع پر پورا سر گھٹا

دیا۔

حجامت بنوا چکنے کے بعد ہم احرام اور عمرے کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے۔ اور اس بات سے جو خوشی ہو سکتی ہے' بالخصوص ہم جیسے ندیدوں کو وہ ہوئی۔ یہ ساری رات آنکھوں میں کٹی لیکن یہ اس خوشی ہی کا فیض تھا کہ الحمدللہ طبیعت برابر چاق و چوبند رہی۔ کسی تکان کا احساس نہیں ہوا۔

اب اذان فجر کا وقت قریب تھا۔ ہم معلم صاحب کے مکان پر آئے تاکہ نہادھو کر اور کپڑے بدل کر نماز فجر کی جماعت میں شریک ہو سکیں۔ ہم نے اپنے حد تک پوری کوشش کی' لیکن انتہائی کوشش کے باوجود جب حرم پہنچے تو جماعت ہو چکی تھی۔ اس حادثے کا بڑا صدمہ ہوا۔

مکہ معظمہ میں ایک عشرہ قیام

عمرے سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہمیں مکان کی تلاش ہوئی۔ مکان سے متعلق میری شرطیں صرف دو تھیں۔ ایک تو یہ کہ حرم شریف سے فی الجملہ قریب ہو تاکہ جماعتوں کی حاضری میں آسانی ہو' دوسری یہ کہ اس میں ایک کھلی ہوئی چھت ہو' اگرچہ وہ کتنی ہی مختصر ہو تاکہ شب میں گرمیوں میں کمرے کے اندر نہ سونا پڑے۔ میرے نزدیک یہ دونوں شرطیں کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن انھی دو شرطوں کی وجہ سے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو مکان کی تلاش میں دن بھر دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ اگر کوئی مکان موزوں ملتا تھا تو ہمارے لیے اس اس کا کرایہ ناقابل برداشت' اور اگر کرایہ قابل برداشت ہوتا تو مکان ناقابل برداشت۔ خدا خدا کر کے شام تک باب ابراہیم کے محاذات میں ایک مکان کی چوتھی منزل کا معاملہ طے ہوا۔

ایک کمرہ تھا جس میں دو آدمی بمشکل لیٹ سکیں۔ ایک چھجہ سا تھا جس پر چار آدمی بمشکل بیٹھ سکیں۔ ایک مختصر سا گوشہ تھا' اس سے چاہے باورچی خانے کا کام لیجیے یا غسل خانے کا۔ البتہ ایک مختصر سی چھت اس کے ساتھ ضرور تھی۔ بس اتنی سی مکانیت رکھنے والا تھا اور کرایہ اس کا نو سو ریال تھا۔ اس کی خستہ حالی بھی قابل رحم حالت تک پہنچی ہوئی تھی۔ بس اس میں اگر کوئی خوبی تھی تو یہ تھی کہ اس کے چھجے پر اگر کوئی بیٹھے تو وہاں سے جبل نور کی وہ چوٹی بھی دکھائی دیتی تھی جس پر غار حرا ہے اور سامنے بیت اللہ بھی نظر آتا تھا۔ جب صاحب مکان سے اس مکان کی خستہ حالی اور اس کے اس بھاری کرایے کا ذکر آتا تو وہ انھی دونوں چیزوں کی طرف اشارہ کر کے ہمیں قائل کر دیتا اور ہمیں قائل ہو جانا پڑتا۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مکانوں کے کرائے تو ہمیشہ غیر معمولی رہے ہیں اور ایسے مقامات پر کرایوں کی زیادتی ایک بالکل قدرتی امر ہے لیکن ادھر اس زیادتی کا ایک خاص سبب بھی ہوا ہے۔ وہ یہ کہ حکومت نے بہت سے مکانات حرم کی توسیع کے سلسلے میں منہدم کرا دیے اور حجاج کے ٹھہرانے کے لیے نہ تو کوئی متبادل انتظام کیا اور نہ کرایوں پر کوئی کنٹرول قائم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاجیوں کو یا تو بغیر مکانوں کے سڑکوں پر گزر کرنا پڑا یا اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ کرائے ادا کرنا پڑے۔ بڑی شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ حجاج کے ٹھہرنے کے لیے متعدد مدینۃ الحجاج مکہ معظمہ میں بنائے جائیں۔ لیکن سعودی حکومت اس وقت توسیع حرم کی اسکیم کی تکمیل میں مصروف ہے اور بظاہر وہ ابھی کئی سال تک اس اسکیم سے فارغ ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایک بہت ہی عظیم ذمہ داری ہے جو سعودی حکومت نے اپنے سر پر اٹھائی ہے۔ اگر وہ اس سے عہدہ برآ ہو گئی (ہماری دلی آرزو اور قلبی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے اور اس کے وسائل میں برکت عطا فرمائے) تو یہ ایک عظیم تاریخی کارنامہ ہو گا۔ لیکن اس دوران میں سعودی حکومت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ حجاج کے لیے مکانات کے مسئلے پر غور کر سکے گی حالانکہ یہ مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے۔ اگر سعودی حکومت نے اس کا کوئی فوری حل نہ نکالا تو حجاج کے لیے یہ تکلیف ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ ہمارے نزدیک یہ کام تمام مسلمان حکومتوں کے مل کر کرنے کا ہے۔ سعودی حکومت کو چاہیے کہ وہ اس مقصد کے لیے کوئی ایسی اسکیم بنائے جس میں سب حصہ لے سکیں اور وہ بے جا خودداری سے بالاتر ہو کر اس میں تعاون کے لیے تمام مسلمان حکومتوں کو دعوت دے۔

مکان مل جانے کے بعد سفر کی حالت کچھ حضر میں تبدیل ہوئی۔ راشن وغیرہ ہمارے پاس موجود ہی تھا مٹی کے تیل سے جلنے والا ایک چولہا خرید کر ہم نے کھانے پکانے کا گھریلو نظم قائم کر لیا۔ بازار سے سبزیاں وغیرہ ہر قسم کی مل جاتی تھیں اگرچہ کراچی اور لاہور کی نسبت سے بہت گراں۔ گھی یہاں نایاب ہے۔ دودھ آسانی سے ڈبوں والا ہی ملتا ہے۔

کھانے کی چیزوں کی یہ گرانی اور نایابی دیکھ کر ہم اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ ہمارے پاس آٹے، چاول، گھی اور مسالاجات کی کافی مقدار موجود تھی۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ ان چیزوں کے یہاں سے لاد کر لے جانے میں اصل دخل حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی ہمت کو تھا۔ اگر میری چلتی تو میں ہلکے پھلکے سفر کے شوق میں بالکل قلندرانہ چل کھڑا ہوتا اور اس قلندری کا مزا وہاں جا کر چکھتا۔ یہ بات ہر شخص کو نوٹ کر لینی چاہیے کہ حجاز کے عام ہوٹلوں کے کھانے ہمارے مذاق کے اس قدر خلاف ہوتے ہیں کہ ہم اضطرار اور مخمصہ کی حالت میں ان سے جان تو بچا سکتے ہیں لیکن سیری اور آسودگی کسی طرح نہیں حاصل کر سکتے اور اگر کوئی صاحب مذاق کے سوال کو بالفرض اہمیت نہ بھی دیں تو مصارف کا سوال تو ہم جیسوں کے لیے بہرحال اہمیت رکھنے والا ہے۔

مکان مل جانے کے بعد میری طبیعت یکسو ہو گئی۔ پنج وقتہ نمازوں کے اوقات کے علاوہ تین وقت میں نے حرم میں حاضر ہونے کے لیے اور خاص کر لیے۔ ایک ۸ اور ۹ بجے صبح کے درمیان کا وقت، اس وقت عام طور پر حجاج کھانے پکانے اور سودا سلف لانے میں مصروف ہوتے ہیں اس وجہ سے حرم میں ہجوم کم ہوتا ہے۔ طواف وغیرہ میں آسانی ہوتی ہے، پھر دھوپ بھی قابل برداشت ہوتی ہے۔ دوسرا مغرب سے کچھ پہلے کا وقت۔ میں مغرب سے پہلے حرم میں پہنچ جاتا، طواف کرتا، پھر مغرب و عشا کی نمازیں وہاں سے پڑھ کر گھر لوٹتا۔ تیسرا فجر کی نماز سے پہلے کا وقت۔ یہ وقت بھی میں نے طواف وغیرہ کے لیے پر سکون پایا۔ بقیہ اوقات گھر پر گزارتا۔ اگر کوئی صاحب ملنے کے لیے آ گئے تو ان سے ملاقات کر لیتا ورنہ کچھ پڑھتا یا آرام کرتا۔

حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب بیت اللہ کے طواف سے جب فرصت پاتے تو بلدامین کے طواف کے لیے نکل جاتے۔ حرم میں نماز کے اوقات میں آ جاتے اور پھر نماز اور طواف کے بعد بالا بالا ہی کسی اور مہم پر روانہ ہو جاتے۔ میں نے ان کو کھانے اور سونے کے اوقات کے معاملے میں ہمیشہ بے نظم آدمی پایا ہے۔ یہ چیز میرے اور ان کے درمیان عرصے سے ایک نزاعی مسئلہ بن چکی ہے۔ میں نے اس سفر میں کوشش کی کہ ان

کو اوقات کا کچھ پابند بناؤں۔ اس غرض کے لیے ان کو دوستانہ مشورے بھی دیے، مشفقانہ نصیحتیں بھی کیں، بزرگانہ تنبیہیں بھی کیں لیکن میری ہر چیز بے اثر رہی۔

خانہ کعبہ کا جلوہ

چونکہ ہم ایام حج سے بہت پہلے پہنچ گئے تھے، ابھی حجاج کا پورا اجتماع نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے تھوڑے سے اہتمام سے آدمی تمام مطلوب و محبوب جگہوں، حجراسود، رکن یمانی، حطیم، ملتزم، باب کعبہ، مقام ابرہیم پر آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ میری دلچسپی زیادہ تر حرم میں بیٹھنے سے تھی۔ مجھے خانہ کعبہ کا جلوہ بڑا محبوب معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے چند دنوں کے بعد بیت اللہ کے دروازے کی طرف سے ذرا سا پردہ سرکا دیا گیا۔ اس چیز نے میرے شوق دید کو اور بھڑکا دیا۔ میں نے خانہ کعبہ کو ہر زاویے سے دیکھا۔ کبھی مقام ابرہیم کے پاس سے، کبھی میزاب کی طرف سے۔ کبھی باب ابراہیم کی طرف کبھی باب الجیاد کی طرف سے۔ جدھر جی چاہتا بیٹھ جاتا اور خانہ کعبہ کو دیکھتا رہتا۔ مجھے اس کو دیکھنے سے کبھی سیری نہیں ہوئی۔

یہ بات نہیں ہے کہ یہ عمارت کوئی بڑی خوبصورت عمارت ہے۔ اس میں خوبصورتی تو کوئی بھی نہیں ہے۔ جو پتھر اس میں لگے ہوئے ہیں ان میں شاید ہی کوئی دو پتھر ایک سائز کے ہوں۔ یہ پتھر اپنے رنگ کے لحاظ سے بھی کچھ نگاہوں کو جذب کرنے والے نہیں ہیں۔ ان پر کوئی نقش و نگار بھی نہیں ہے۔ غرض ظاہری زیب و زینت کی کوئی چیز بھی دل کو مائل کرنے والی نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو محبوبیت، جو دلکشی جو حسن و جمال جو سادگی و پرکاری اور جو عظمت و شوکت اس عمارت میں میں نے پائی وہ کسی اور چیز میں نہیں پائی۔ میں نے اکثر خیال کیا کہ دنیا میں کتنی مسجدیں ہیں جن کے ایک ایک گوشے کی تعمیر پر اس کے کسی ایک ہی کونے سے اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور شان دار سامان تعمیر فراہم کر لیا جا سکتا ہے جو بیت اللہ کی تعمیر میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن آخر کیا بات ہے کہ جو چیز اس عمارت میں ہے وہ کسی عمارت میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا

ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر پر اپنی محبت کا خاص پر تو ڈالا ہے اور یہ محبت صلہ ہے اس خلوص نیت کا جس خلوص نیت کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے خاص اپنے ہاتھوں سے اس کی تعمیر فرمائی۔

بیت اللہ بالکل نشیب میں واقع ہے۔ حرم کے چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں جو وادی ہے اس وادی کے سب سے نچلے حصے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے اس گھر کی تعمیر فرمائی ہے۔ آپ حرم کے جس دروازے سے بھی داخل ہوں، آپ بیت اللہ کی طرف جائیں گے اور اس طرح جائیں گے جس طرح آدمی بلندی سے نشیب کی طرف جا رہا ہو۔ احادیث میں خانہ کعبہ کو حوض کوثر کا مجاز کہا گیا ہے۔ سو واقعہ یہ ہے کہ اس کی شکل بھی کچھ حوض ہی سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ حرم کے وسط میں خانہ کعبہ سیاہ غلاف میں ملبوس چشم تصور کو کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے ایک حوض ہو اور اس حوض کے وسط میں سیاہ گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا ہو۔

کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جس خدا نے اس دنیا کی تمام بلندیاں پیدا کی ہیں، آخر اس نے اپنے گھر کی تعمیر ایک نشیب میں کیوں کرائی۔ یہیں متعدد پہاڑ تھے، ان پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ پر بھی اس کی تعمیر ہو سکتی تھی اور اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہیں سے زم زم کا چشمہ بھی جاری ہو سکتا تھا۔ اس سوال کا وہی جواب مجھے پسند آیا جو میرے استاذ مولانا حمیدالدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ نے دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سفرنامہ کے قارئین بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مولانا اپنی کتاب "الرای الصحیح فی من ھوالذبیح" میں بیت القدس کا ذکر کرنے کے بعد بیت اللہ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

> ہاں ایک دوسرا گھر ہے اس کو دیکھو تو اس کے ہر گوشے اور ہر کونے میں ابراہیمی سادگی کا جمال فطرت ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ وہ کون؟ بطحائے مکہ کا بیت اللہ الحرام! وہ بت پرستوں آفتاب پرستوں اور ستارہ پرستوں کے معابد کے بالکل برعکس۔ نشیب زمین میں تعمیر ہوا اور گویا اپنی ہیئت ہی سے اس حقیقت کا

اعلان کر رہا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان بلندیوں پر چڑھ جائے بلکہ اس کا قرب زیادہ سے زیادہ جھک جانے اور پست ہو جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ (قربانی کی حقیقت اور اس کی تاریخ ص۔ ۱۸۳)

حرم کی نمازیں

بیت اللہ نماز کا مرکز ہے اس بات کو جانتے تو سب ہیں لیکن اس مرکزیت کی حقیقت سمجھ میں اس وقت آتی ہے جب آدمی نماز کے اس مرکز میں پہنچ کر نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہو سکتا جب آپ حرم میں داخل ہوں اور ہزاروں انسانوں کو مشغول رکوع و سجود نہ پائیں۔ حرم کے میناروں سے جس وقت فجر کی اذانیں بلند ہوتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدائے بازگشت صرف آس پاس کی پہاڑیوں ہی سے نہیں بلکہ آسمان و زمین کے ہر کونے سے آ رہی ہے۔ نماز کے اوقات میں جب لوگ حرم کے ہر طرف سے حرم میں داخل ہونا شروع ہوتے ہیں تو راستے رک جاتے ہیں' گلیوں سے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ حرم میں داخل ہونے کے لیے بیسیوں بڑے بڑے دروازے ہیں لیکن یہ تمام دروازے ناکافی ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر جمعہ کے دن تو جس شخص کو اطمینان کے ساتھ سجدہ کرنے کی جگہ مل جائے وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے۔ میں جگہ حاصل کرنے کے لیے تین تین گھنٹے پہلے سے جمعہ کے دن گیا ہوں لیکن اطمینان کی جگہ حاصل کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر اطمینان کی جگہ ملی تو مسعیٰ کی بالائی منزل پر ملی' حرم کے اندرونی حصے میں کبھی نہیں ملی۔

یہاں نماز اور اذان کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے جو شخص تکبیر تحریمہ کا ثواب حاصل کرنا چاہے اس کو بہت مستعد رہنا پڑتا ہے۔ اگر مکان حرم سے ذرا بھی دور ہو تو جماعت کی حاضری صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی پہلے سے تیار رہے۔ نمازیں مختصر اور معتدل ہوتی ہیں۔ امام حرم کی قرات نہایت موثر اور دل آویز

ہوتی تھی اس وجہ سے میرا دل یہ چاہتا ـــــ بالخصوص نماز فجر میں ـــــ کہ وہ کوئی لمبی سورت پڑھیں لیکن ان کی قرات ہمیشہ مختصر ہوتی تھی۔

امام حرم لاکھوں انسانوں کی امامت کرتے ہیں جن میں بلامبالغہ ہزاروں مریض' بوڑھے اور ناتواں ہوتے ہیں۔ ایک عظیم تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جنہیں جگہ کی تنگی کے سبب سے دھوپ میں کھڑے ہونا پڑتا ہے' اور مکہ معظمہ کی دھوپ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس دھوپ کا تجربہ کرنے کے بعد ہی وہ حدیث سمجھ میں آتی ہے جس میں حضور نے فرمایا کہ الحر من فیح جھنم پھر ہزاروں خواتین ہوتی ہیں جن کے ساتھ ان کے ننھے ننھے بچے ہوتے ہیں۔ ایک دن میں نے ایک حبشی خاتون کو باب الجیاد کے سامنے دھوپ میں اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا کہ ایک بچے کو وہ پیٹھ پر لادے ہوئے ہیں' دوسرے کو زمین پر لٹا رکھا ہے اور تیسرا پاس کھڑا ہوا رو رہا ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود نماز میں ان کا انہماک قابل رشک تھا۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر ہماری مسجدوں کے امام صاحبان کی طرح یہاں کے امام بھی لمبی لمبی تقریریں کریں اور لمبی لمبی سورتیں پڑھیں تو ان بے چاروں کا کیا حال ہو۔

حرم میں نمازوں کا منظر اتنا شاندار ہوتا ہے کہ جس نے دیکھا نہیں ہے اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ خانہ کعبہ کو مرکز قرار دے کر گول دائروں کی شکل میں جب لاکھوں نمازی کھڑے ہوتے ہیں' ٹھیک وسط میں بیت اللہ ہوتا ہے' مقام ابراہیم کے پاس سے امام کی صدائے قرات بلند ہوتی ہے' آس پاس سڑکیں اور چھتیں یہاں تک کہ وہ مچان بھی' جو حرم کی تعمیر کے سلسلے میں بنائے گئے ہیں' نمازیوں سے رک جاتے ہیں تو اس منظر کو دیکھ کر فی الواقع قبلہ کی اہمیت کچھ سمجھ میں آتی ہے اور اس امت کی وحدت کی جو حقیقت ہے اس کا ایک جلوہ آنکھوں کو بھی نظر آ جاتا ہے۔ میں نے مسعیٰ کی بالائی منزل سے بعض مرتبہ یہ منظر دیکھا ہے۔ اس منظر کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا ایک ہی منظر ہوتا ہے۔

ایک دن میں نماز میں ذرا دیر سے پہنچا۔ جب میں باب ابراہیم کی دلیز میں داخل ہوا

تو امام پہلی رکعت کے رکوع سے فارغ ہو کر سجدے میں جا رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں میں ذرا دیر کے لیے ٹھٹھک گیا۔ میری نگاہ جو اٹھی تو میں نے باب ابراہیم سے لے کر مسعیٰ تک زمین پر پڑی لاکھوں پیشانیوں کا منظر دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں بالکل ششدر رہ گیا۔ حشر کے میدان کا جو تصور میرے ذہن میں تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت ساری کائنات سجدے میں ہے' صرف میں ہی تنہا محروم ہوں۔ مجھے جانماز بچھانی تھی لیکن میں نے جانماز ایک طرف پھینک دی اور بے تحاشا سجدے میں گر پڑا۔

حرم میں جس طرح لباسوں اور صورتوں کی ساری قسمیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح نماز کی بھی وہ تمام ہیئتیں جمع ہو جاتی ہیں جن کی اسلام میں گنجائش ہے۔ آپ صف میں کھڑے ہوں گے تو آپ کے داہنے بائیں' آگے پیچھے مختلف مسلکوں کے مطابق نمازیں ادا کرنے والے آپ کو مل جائیں گے۔ نماز کی بنیادی چیزیں مشترک ہوں گی' لیکن ظواہر میں بڑا اختلاف ہو گا۔ حرم میں اس طرح کے اختلافات کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص ذرا سا بھی اس سے مختلف طریقے پر نماز پڑھ لے جو طریقہ مسجد کے عام نمازیوں کا ہے تو سب کی نگاہیں اٹھ جائیں گی۔ بلکہ اندیشہ ہنگامہ برپا ہو جانے کا پیدا ہو جاتا ہے لیکن حرم میں میں نے اس طرح کے کسی اختلاف پر کسی کو نکیر کرتے دیکھا اور نہ سنا۔ وہاں یہ حقیقت ہر شخص پر روشن ہو جاتی ہے کہ ان ظواہر کے اختلاف کے باوجود بھی مسلمان اور مسلمان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

طواف کا منظر

طواف کا منظر بھی بڑا ہی دلکش اور وجد انگیز ہوتا ہے۔ آپ چوبیس گھنٹوں میں سے جس وقت بھی جی چاہے حرم میں داخل ہوں' لیکن آپ مطاف کو خالی نہ پائیں گے۔ دوپہر کی سخت دھوپ میں جب مطاف کی سلیں جلتے توے کی مانند گرم ہوتی ہیں اور اوپر سے آگ برس رہی ہوتی ہے' ہزاروں خدا کے بندے اس طرح طواف میں منہمک رہتے ہیں

گویا فرش گل پر چل رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سخت سے سخت بارش میں بھی جبکہ کبھی کبھی مطاف میں کمر کمر تک پانی کھڑا ہو جاتا ہے طواف کرنے والوں اسی طرح طواف کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایام حج کے علاوہ دوسرے زمانوں میں بھی مطاف طواف کرنے والوں سے بالکل خالی کسی وقت بھی نہیں ہوتا۔ صرف نمازوں کے اوقات میں تھوڑے سے وقفے کے لیے حرم کی پولیس طواف کو روک دیتی ہے۔ اسی وقفے میں طواف کرنے والے مطاف ہی میں اپنی صفیں بنا لیتے ہیں اور نماز سے فارغ ہوتے ہی پروانہ وار بیت اللہ کے اردگرد چکر شروع کر دیتے ہیں۔

طواف کرنے والوں میں بوڑھے' جوان' عورتیں بچے سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے معذور اور مفلوج بھی میں نے دیکھے جو گھسٹ گھسٹ کے چل رہے تھے۔ کتنے لب گور مریض چارپائیوں پر اٹھا کے لائے جاتے ہیں' اور اسی حالت میں ان کو طواف کرایا جاتا ہے۔ الغرض ہر طبقے ہر درجہ اور ہر مرتبے کے لوگ آپ کو مطاف میں شانہ بشانہ طواف کرتے ہوئے مل جائیں گے۔ ایک زمانے میں تو وقت کے امرا اور سلاطین بھی غربا اور عوام کے پہلو بہ پہلو اس مطاف میں نظر آتے تھے۔ ایک کا دامن دوسرے سے الجھتا تھا اور ایک کی عبا دوسرے کے پاؤں سے پامال ہوتی تھی۔ لیکن اب یہ منظر دیکھنے میں نہیں آتا۔ تاریخ کا یہ دور اب گزر گیا۔

طواف بھی درحقیقت نماز کی ایک قسم ہے یہ نماز صرف حرم میں بیت اللہ کے اردگرد پڑھی جاتی ہے۔ اس میں تھوڑی سی آزادی چونکہ جذبے کے اظہار کی بھی مل جاتی ہے اس وجہ سے بڑی جلدی تصور شمع و پروانہ کی تمثیل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور طبیعت پر ایک وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کیفیت کا اثر بہتوں پر محسوس کیا۔ یہ کیفیت ان اوقات میں بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جو اوقات مطاف کی سرجوشی اور تلاطم کے ہوتے ہیں۔

فجر اور مغرب و عشا کے درمیان کے اوقات مطاف کے دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ ان اوقات میں نسبت و محبت کا یہ دریا اپنے اصلی جوش پر ہوتا ہے' حجاج کے پرے کے پرے

احرام کے نورانی لباس میں حرم میں داخل ہوتے ہیں اور پھر مطاف میں اترتے ہیں۔ ان کی دعاؤں اور تکبیروں سے ساری فضا گونج اٹھتی ہے۔ اگرچہ اب مطاف کا دائرہ بہت وسیع کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان اوقات میں طواف کرنے والوں کا جوش و خروش اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ موجیں ساحل سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کو توڑ کے رکھ دیں گی۔ ان اوقات میں اس دریا میں اترنے کی ہمت تو میں اپنی پست ہمتی کے سبب سے بہت کم کرتا تھا لیکن ساحل پر بیٹھ کر اس کا مشاہدہ ضرور کرتا تھا۔ اس مشاہدے ہی کو میں اپنے جیسے کمزور آدمی کے لیے عبادت سمجھتا تھا۔ میں اس مشاہدے میں اس طرح مستغرق ہو جاتا کہ میرا جسم اگرچہ ساحل پر ہوتا لیکن مرا دل ان موجوں کے اندر ہی کھویا رہتا ——— مجھے یہ خیال باربار آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کی کسی خدمت کو قبول فرمالیتا ہے تو اس کی یہ شان ہوا کرتی ہے۔

بعض کھٹکنے والی چیزیں

اس دوران میں بعض بعض چیزیں مجھے کھٹکتی بھی رہیں لیکن میں ان کا یہاں ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول اول مجھے بعض باتیں کھٹکتی تو رہیں لیکن ان کی اصلاح کی کوئی شکل میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بعد میں جب حج کے ایام گزر گئے اور مجھے ہر طرح کے حالات کا اچھی طرح تجربہ اور مشاہدہ ہو گیا تو ساری محتاج اصلاح باتوں کی میں نے ایک فہرست بنائی۔ میں آگے چل کر کسی مناسب موقع سے ان کا ذکر کروں گا اور ساتھ ہی ان کی اصلاح کے لیے اپنی تجاویز بھی پیش کروں گا۔

ملاقاتیں

اس دوران میں لوگوں سے میرا ملنا جلنا بہت کم ہوا۔ ایک روز میرے قدیم وطن کے ایک جان پہچان رکھنے والے حرم میں مل گئے۔ تو انہوں نے ان لوگوں کو میری موجودگی کی اطلاع دے دی جو اعظم گڑھ (بھارت) سے آئے تھے۔ یہ لوگ قدیم وطنی رشتے کی بنا پر محبت سے ملتے رہے۔ ایک روز ایک بزرگ مولانا صاحب تبتی نے جو ایک مہاجر ہیں

چائے پر بلایا۔ وہاں ایک پاکستانی ڈاکٹر' ڈاکٹر احمد علی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ یہ سعودی اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ ان سے ایک ہی ملاقات میں ان کے اخلاق کے سبب سے بے تکلفی اور محبت ہو گئی۔ اور ان کی یہ دوستی' آگے چل کر معلوم ہو گا کہ میرے بڑے کام آئی۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کے واسطے سے لائلپور کے ایک کرم فرما ملک عبدالحق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اب یہ مکہ معظمہ میں مقیم ہیں اور وہاں ان کا اچھے پیمانے پر کاروبار ہے ان کی خوش اخلاقی اور محبت کی وجہ سے ان سے برادرانہ تعلقات ہو گئے اور ہمیں ان کی عنایت سے بہت سی سہولتیں حاصل ہو گئیں۔ اس دوران کی ایک اور بزرگ کی ملاقات مجھے نہیں بھولتی اور آئندہ بھی شاید کبھی نہ بھولے۔ یہ مرد بزرگ ضلع اٹک کے رہنے والے ہیں اور اب ہجرت کر کے جوار بیت اللہ میں جا بسے ہیں۔ ان کا نام مجھے افسوس ہے یاد نہیں رہا۔ مجھے یہ نیکی اور اخلاص کے ایک پیکر مجسم نظر آئے۔ یہ میرے مدینہ منورہ روانہ ہونے سے چند دن پہلے مجھ سے ملے۔ انہوں نے مختصر طور پر اپنا تعارف کرایا۔ اور اس کے بعد صرف ایک فقرہ یہ کہا کہ "آپ نے بھی جماعت اسلامی کو چھوڑ دیا"۔ یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کو زار وقطار اور مسلسل روتے دیکھ کر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بغیر کوئی بات کہے میرے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ حج کے بعد وہ ایک مرتبہ اور مجھ سے ملے اور اس مرتبہ بھی ان کا طرز عمل وہی رہا۔ میں نے ان سے کہا کہ "جماعتی معاملات پر میں یہاں کوئی گفتگو پسند نہیں کرتا ورنہ آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔" اس کے جواب میں انہوں نے رونے کے سوا اور کوئی بات نہیں کی۔ ان بزرگ سے اس دنیا میں اب پھر ملنا نصیب ہو یا نہ ہو مگر ان کے اخلاص دینی کا ایک گہرا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا ہے۔

یہ ملاقاتیں بھی بس اتفاق سے ہو گئیں ورنہ میں لوگوں سے بالکل بے تعلق سا رہا۔ اخوانی احباب و مخلصین اور دوسرے اہل علم سے حج کے بعد ملاقاتیں ہوئیں۔ میں جس مکان میں ٹھہرا تھا اس کے نیچے کی منزلوں میں ہندوستان کے بہت سے حجاج ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور سب مجھ سے غائبانہ واقفیت اور محبت رکھتے تھے۔ لیکن ان کو میری موجودگی کی

اطلاع اس وقت ہو سکی جب میری وطن کے لیے واپسی میں صرف چند دن باقی رہ گئے۔ ان لوگوں کو میری اس خاموشی اور بے تعلقی سے سخت شکایت ہوئی۔ یہی شکایت میرے دوسرے بہت سے احباب اور عزیز شاگردوں کو ہوئی۔ میں یہ فیصلہ اب تک نہیں کر سکا کہ انؔ مخلصین کی یہ شکایت بجا تھی یا میرا یہ طرز عمل صحیح تھا۔ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا یہ طرز عمل غلط تھا۔ لیکن میں اپنی طبیعت کی افتاد کو کیا کروں۔

حج سے پہلے منیٰ اور عرفات میں

ملک عبدالحق صاحب لائلپوری کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ یوں تو ان کی بہت سی عنایات قابل ذکر ہیں' لیکن یہاں میں صرف ان کے ایک احسان کا ذکر کروں گا۔ وہ یہ کہ انہوں نے اس دوران میں ہمیں منیٰ و عرفات اور دوسرے بعض تاریخی اور بابرکت مقامات کی اپنی گاڑی میں بٹھا کر زیارت کرا دی۔ یہ چیز میرے ذہن میں نہیں تھی۔ انھی کی تحریک سے ذہن میں آئی اور انھی کی راہنمائی میں ہمیں ہر جگہ حاضری کا موقع مل گیا۔ حج کے موقع پر اتنا ازدحام اور اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ آدمی ادائے فرض کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا اس طرح ہم نے ہر جگہ پہلے سے دیکھ لی اور تمام بابرکت مقامات میں اطمینان سے نفلیں پڑھیں۔ اور اپنے لیے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لیے دعائیں کیں۔ میں جب جبل رحمت پر پہنچا اور وہاں سے میں نے ہر طرف عرفات کے میدان پر نظر دوڑائی تو میرے دل نے گواہی دی کہ یہ خدا ہی کی شان ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح کے ایک چٹیل اور بے آب وگیاہ میدان کو مرجع خلائق بنا دے۔ اور ساری دنیا کے کونے کونے سے لوگ کھنچ کھنچ کر اس میدان میں اُس کو ڈھونڈنے آئیں۔ اللہ اکبر' اس ریگ زار کے چپے چپے پر کیسی کیسی مقدس پیشانیوں کے سجدوں کے نشانات ثبت ہیں۔ اور اس کی ریت کا ایک ایک ذرہ کیسی کیسی پاکیزہ آنکھوں کے آنسوؤں سے سیراب ہوا ہے۔

جبل رحمت کے نیچے کسی اللہ کے بندے نے برگد کے دو درخت لگا دیے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ کسی پاکستانی حاجی کی خدمت ہے۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ درخت

شاداب ہیں اور اب خدا کے فضل سے نکل چلے ہیں۔ ان درختوں کے پاس ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ ہے۔ ملک صاحب نے قہوہ خانے سے چائے منگائی اور ہم نے ان درختوں کے سائے میں بیٹھ کر پہلے ٹھنڈا پانی پیا' اور پھر بے وردہ کی چائے پی۔

اس سرزمین پاک کی آب وہوا کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ یہاں صراحیوں اور مشکیزوں میں رکھا ہوا پانی بڑی جلدی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے مشکیزے میں پانی بھر کر ہوا میں لٹکا دیجیے پندرہ بیس منٹ میں وہ اتنا ٹھنڈا ہو جائے گا کہ آپ برف کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے ورنہ یہاں جس قسم کی پیاس لگتی ہے اس کا مداوا پیاس بجھانے کے مصنوعی طریقوں سے ناممکن تھا۔ یہاں کا سایہ بھی بڑی نعمت ہے۔ دھوپ میں نکلیں تو معلوم ہو گا کہ آپ آگ کے شعلوں سے لڑ رہے ہیں۔ لیکن سائے میں آ جائیے تو فوراً ہی ساری گرمی کافور ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ سایہ کسی معمولی جھاڑی ہی کا ہو۔ لوگ پورا پورا دن دھوپ میں کھڑے کیے ہوئے ٹرکوں کے سائے میں گزار دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے بھی تھوڑی دیر کے لیے ایک ٹرک کے سائے میں پناہ لی اور میں نے محسوس کیا کہ اس سرزمین پر ایک ٹرک کے سائے میں بھی اللہ تعالیٰ نے وہی راحت اور تسکین رکھی ہے جو ہمارے ملک کے کسی سایہ دار درخت کی گھنیری چھاؤں میں میسر آ سکتی ہے۔ مجھے جبل رحمت کے یہ دونوں درخت بہت یاد آتے ہیں۔ کتنے مبارک پڑوس میں ان کو جگہ ملی ہے۔

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ

مکہ معظمہ میں ہفتہ عشرہ قیام کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ حج سے پہلے ہی ہم مدینہ منورہ ہو آئیں۔ ابھی حج میں کم و بیش ایک مہینہ باقی تھا۔ ہم نے خیال کیا کہ اگر اس اثنا میں ہم مدینہ منورہ سے لوٹ آتے ہیں تو ہمیں حج کے بعد مکہ معظمہ میں قیام کے لیے کافی وقت مل جائے گا اور اس وقت سے ہم بہتر فوائد حاصل کر سکیں گے۔ چنانچہ اپنے اس ارادے کا ذکر ہم نے اپنے معلم صاحب سے کیا اور ہماری خواہش کے مطابق انہوں نے ہمارے سفر کا انتظام کر دیا۔

معلم صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم نے صرف نہایت ضروری سامان ساتھ لینے کے لیے باندھا۔ بقیہ سارا سامان اُسی مکان میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا جس میں ہم ٹھہرے تھے اگرچہ اس مکان کا دروازہ قفل اور کنڈے وغیرہ کی قید و بند سے تقریباً آزاد تھا' اس طرح کے کسی مکان میں لاہور یا کراچی میں کوئی شخص دو گھنٹے کے لیے بھی اپنا سامان چھوڑنے کی غلطی کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن سعودی عرب میں شرعی حدود کے نفاذ کی وجہ سے الحمدللہ چوری چکاری کا پوری طرح سدباب ہو چکا ہے۔

روانگی کے دن ایک مقررہ وقت پر لاری خود ہمارے دروازے پر آ گئی۔ حجاج کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ معلم حضرات اپنے اپنے مسافروں کی تعداد سے لاریوں والوں کو مطلع کر دیتے ہیں اور لاریاں ان معلموں کے ڈیروں سے مسافروں کو اٹھا لیتی ہیں۔ یہ انتظام مجھے نہایت سہولت بخش معلوم ہوا' ورنہ معلوم نہیں ہمیں سامان لادے لادے کس کس اڈے پر پھرنا پڑتا۔

ایک چیز میں نے یہ بھی محسوس کی کہ اس دن ہمارے معلم سید عقیل عطاس صاحب

بذات خود ہمارے سفر کے اہتمام میں بہت سرگرم رہے۔ ویسے تو وہ بہت کم آمیز اور کم سخن سے آدمی ہیں بلکہ کچھ نازک مزاج اور آرام پسند بھی معلوم ہوئے لیکن اس دن میں نے دیکھا کہ وہ ہماری روانگی کے وقت سے بہت پہلے سے ہمارے مکان کے نیچے ایک دوکان کے تخت پر آ کر بیٹھ گئے اور وہاں سے اس وقت تک نہ اُٹھے جب تک ہماری لاری روانہ نہ ہوئی۔ سارا انتظام خود اپنی نگرانی میں اپنے آدمیوں سے کرایا۔ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی اور یہ معلوم کر کے مجھے مزید خوشی ہوئی کہ ان کا یہ طرز عمل کچھ خاص طور پر ہمارے ہی ساتھ نہیں تھا بلکہ اپنے حاجیوں کے ساتھ ان کا عام طرز عمل ہی یہی ہے۔

ہماری لاری مدینہ منورہ کے لیے راوانہ ہوئی اور مجھے یہ خیال آیا کہ اب خدا نے چاہا تو ہم صبح تک اس شہر کو بھی دیکھ لیں گے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔ جہاں حضور کی مسجد ہے' جہاں حضور کا مزارِ اقدس ہے' جس کے چپے چپے پر' ازواج مطہرات کے' بنات طاہرات کے' صحابہ اور صحابیات کے' شہدا اور صالحین کے متبرک آثار ہیں تو کون بتا سکتا ہے کہ دل کی خوشیوں کا کیا حال تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے شہر سے ایک مسلمان کے دل کا لگاؤ ایک بالکل فطری لگاؤ ہے۔ یہ لگاؤ محض عقلی اور قانونی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بڑا دخل جذبات کو بھی ہے۔ آخر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑھ کر کس کے احسانات ہم پر ہیں' ہماری ہدایت و نجات اور ہماری دنیا و عقبیٰ کی صلاح و فلاح کے لیے وہ دکھ کس نے جھیلے ہیں' وہ تکلیفیں کس نے اُٹھائی جو حضور نے اُٹھائی ہیں' اس وجہ سے میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ مدینہ کے لیے روانہ ہوتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا ایک جوش ہے جو ابلا پڑ رہا ہے۔

اس سفر میں ہماری لاری کا ڈرائیور دیکھنے میں تو کچھ ثقہ اور دین دار نظر آیا لیکن بخشیش کے معاملے میں یہ اپنے پہلے بھائیوں سے بھی کچھ زیادہ چوکس نکلا۔ اس نے صرف بخشیش کا مطالبہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ خود ہی مقرر بھی کر دیا کہ فی سواری کیا بخشیش دینی ہو گی۔ دھمکی ہر ڈرائیور ایک ہی دیتا ہے یعنی بخشیش نہ دی

یا مطلوبہ مقدار سے کم دی تو وہ اس بات کا ذمہ دار نہیں ہے کہ گاڑی منزل مقصود پر پہنچے گی اور اگر پہنچے گی تو کب پہنچے گی۔ میں کراچی میں ایک صاحب سے بخشیش نہ ادا کرنے کی سزا سن چکا تھا۔ وہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تیسرے دن پہنچ سکے تھے، حالانکہ عام طور پر لاریاں عصر بعد مکہ معظمہ سے روانہ ہوتی ہیں اور صبح کو آٹھ نو بجتے بجتے مدینہ منورہ پہنچ جاتی ہیں۔ مجھے یہ بات یاد تھی اس وجہ سے میں نے حکیم صاحب کو اشارہ کیا کہ بلاتاخیر ڈرائیور کے ارشاد کی تعمیل کیجیے اور کرایئے ورنہ سخت مشکل پیش آ جائے گی۔ بالآخر ڈرائیور کا مطالبہ پورا کیا گیا اور اس کے بعد اس نے پوری رفتار کے ساتھ گاڑی مدینہ منورہ کے راستے پر ڈال دی۔

یہ سڑک نہایت عمدہ اور کشادہ ہے۔ یہی راستہ ابھی کچھ سالوں پہلے تک لوگ اونٹوں سے طے کرتے تھے اور معلوم نہیں کیا کیا مشقتیں جھیلتے تھے لیکن اب نہ راہ کی کوئی مشقت ہے اور نہ کوئی خطرہ اور اندیشہ۔ راستے میں جگہ جگہ پھوس کے جھونپڑوں والے قہوہ خانے نظر آتے تھے لیکن ہمارا ڈرائیور جدہ سے جو چلا ہے تو جا کے رابغ میں ٹھہرا۔ رات کے اندھیرے میں کہیں بستی کی شکل و صورت کا تو کیا اندازہ ہو سکتا البتہ یہ محسوس ہوا کہ یہاں سردی ہے۔

یہاں اتر کر پہلے تو ہم نے عشا کی نماز ادا کی اس کے بعد کھانے اور چائے پینے کا ارادہ کیا۔ سلطان احمد صاحب نے ایک مرتبہ رابغ کی مچھلی کی تعریف کی تھی۔ یہ بات کانوں پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ میری فرمائش پر روٹی اور مچھلی منگوائی گئی۔ جب مچھلی سامنے آئی تو اندھیرا تھا اس وجہ سے اس کی صورت تو میں دیکھ نہ سکا البتہ ایک طرف سے ایک ٹکڑا توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔ منہ میں ڈالنے کو تو بڑے شوق سے ڈال لیا لیکن اس کے نگلنے میں مجھے بڑی زحمت ہوئی۔ میں سخت حیران ہوا کہ آخر سلطان صاحب نے اس مچھلی کی تعریف کس بنیاد پر کی تھی۔ میں ان کی ثقاہت اور ان کے مذاق کے بارے تو کوئی شبہ کر نہیں سکتا تھا اس وجہ سے اس کی تاویل مجھے یہ کرنی پڑی کہ انھوں نے رابغ کے ہوٹلوں کی مچھلی کی تعریف نہیں کی ہوگی بلکہ رابغ کے سمندر کی مچھلی کی تعریف کی ہوگی۔

بہرحال مچھلی تو جیسی کچھ تھی وہ تھی ہمیں اس مچھلی اور روٹی اور خشک چائے کی جو قیمت ادا کرنی پڑی اس سے حجاز میں کھانے کی چیزوں کی گرانی کا اندازہ اچھی طرح ہو گیا۔ بالخصوص اطراف کے شہروں اور قصبات میں۔

رابغ سے روانہ ہوئے تو جا کر بدر کے مقام پر ڈرائیور نے ایک قہوہ خانے کے سامنے گاڑی روکی۔ اس مقام کے دیکھنے کا شوق بھلا کس مسلمان کو نہ ہو گا۔ لیکن رات کے اندھیرے میں سیاہ سیاہ پہاڑیوں کے سوا اور کیا نظر آ سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس اندھیرے ہی میں ہم ادھر ادھر کچھ نگاہیں دوڑانے کی کوشش کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے اوپر سفر کی تکان کا بے انتہا غلبہ تھا۔ میں نے لاری سے اترتے ہی اپنے آپ کو بنتے والی اسی طرح کی ایک چارپائی پر جس طرح کی چارپائیاں حجاز کے قہوہ خانوں اور دیہاتی ہوٹلوں کے سامنے پڑی رہتی ہیں، اپنے آپ کو ڈال دیا۔ ہوٹل والے نے پوچھا کہ "پانی، چائے"۔ میں نے کہا بھائی اس وقت تو مجھے ذرا کمر سیدھی کرنے دے اٹھوں گا تو چائے اور پانی کے مسئلے پر غور کروں گا۔ میں چارپائی پر پڑتے ہی سو گیا۔ کچھ دیر کے بعد چل چلاؤ کا شور اٹھا تو آنکھ کھلی غالباً دو گھنٹے کا موقع ڈرائیور نے دیا لیکن ایسا محسوس ہوا کہ یہاں دو منٹ بھی ٹھہرنا نصیب نہیں ہوا۔ چار و ناچار لاری میں پھر جا کر لد گئے۔ اگرچہ آرام کرنے کا موقع تو نہیں مل سکا لیکن اسی ذرا سے آرام سے دماغ کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ کچھ دور آگے چل کر ڈرائیور نے فجر کی نماز کے لیے گاڑی روکی۔ اگرچہ اس بات سے تو خوشی ہوئی کہ ڈرائیور نے نماز کا موقع دیا لیکن وہ جگہ ایسی تھی کہ جہاں دور دور تک پانی کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ جن کے مشکیزوں میں کچھ پانی موجود تھا انھوں نے تو الٹے سیدھے کچھ اس سے کام چلایا لیکن اکثریت کو تیمم پر قناعت کرنی پڑی۔

مدینۃ الرسول کے آثار

سورج نکلا تو ساتھ ہی مدینۃ الرسول کے آثار طلوع ہونے شروع ہو گئے۔ دور سے احد کی چوٹیاں نظر آئیں۔ یہ وہ پہاڑ ہے جس سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محبت

کرتے تھے اور جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی کہا "اے احد ہم بھی تجھ سے محبت کرتے ہیں"۔ اس وقت سے بس یہی دعا دل اور زبان دونوں پر جاری رہی کہ اگر پروردگار کریم و کارساز نے یہاں آنا نصیب کیا ہے تو یہاں سے محروم نہ لوٹائے۔ مجھے خیال تھا کہ جس طرح ہر شہر میں داخل ہوتے وقت شان دار کوٹھیاں اور عظیم الشان عمارتیں نظر آتی ہیں' اسی طرح یہاں بھی پہلے عالی شان عمارتیں نظر آئیں گی۔ لیکن یہاں اس طرح کی کوئی چیز ہمیں نظر نہیں آئی۔ جدید تمدن نے اپنی کرم فرمائیوں سے اس شہر کو محروم ہی رکھا ہے لیکن مجھے اس چیز سے کوئی شکایت نہیں ہوئی بلکہ بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ اچھا ہوتا اگر یہ اپنی بالکل اصلی شکل میں محفوظ رہتا' اس کے لیے زمان ومکان کی حرکت رک گئی ہوتی' اور یہ ہر تغیر قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکا تو کم از کم یہ تو ہو کہ یہ اپنی شکل سے قریب تر شکل میں نظر آئے۔

شہر میں داخل ہوئے تو ایک ساتھی نے توجہ دلائی کہ افق میں مسجد نبوی کا مینارہ نظر آتا ہے۔ درود وسلام پڑھتے ہوئے میری نگاہوں نے اس سے معانقہ کیا۔ اس کے بعد سے یہ مینارہ ہر شخص کا مرکز نگاہ بن گیا۔ سڑک کے پیچ وخم میں اگر یہ نگاہوں سے ذرا اوجھل ہو جاتا تو دل بے قرار ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد لاری اپنے اڈے پر پہنچ گئی۔

یہاں علاقے علاقے کے الگ الگ معلم ہیں۔ کوئی سندھ کے حجاج کا معلم ہے' کوئی پنجاب کے علاقے کا۔ اسی اصول پر مختلف علاقے مختلف معلموں کو الاٹ کر دیے گئے ہیں۔ ہر علاقے کے معلم متعلق علاقے کی زبان اور معاشرت سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ معلموں کی ایجنٹ اڈے پر موجود تھے۔ انھوں نے ایک ایک حاجی سے علاقے کا نام پوچھا اور اپنے اپنے حاجیوں کو اپنے چارج میں لے لیا۔ مکہ میں یہ صورت حال نہیں ہے۔

بدوی قلیوں نے سامان اٹھایا۔ ان لوگوں کے پاس بڑی بڑی رسیاں ہوتی ہیں۔ سامان' خواہ کتنا ہی بھاری بھاری ہو' اس پر رکھا اور پیٹھ پر اس طرح لاد لیا گویا ریڑھے پر لاد لیا۔

وہ آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے۔ گلیوں سے گزرتے ہوئے معلم صاحب کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ہمارے معلم صاحب کا ڈیرہ بالکل مسجد نبوی کے سامنے تھا۔

مکان کی تلاش

سامنے چند قدم کے فاصلے پر مسجد نبوی ہو تو کون ایسا ہو گا جو صبر کر سکے گا اور سارے کام چھوڑ چھاڑ کر روضہ اقدس پر نہ پہنچنا چاہے گا۔ ہم عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن اول تو سارا سامان سڑک پر پڑا تھا' دوسرے ہم اس طویل سفر سے چور چور بھی تھے اور گرد وغبار سے اٹے ہوئے بھی۔ اس وجہ سے دل کی باگ کھینچنی پڑی۔ فیصلہ ہوا کہ پہلے مکان تلاش کیا جائے پھر نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر مسجد نبوی میں اور روضہ اقدس پر حاضری دی جائے۔

کراچی سے روانہ ہوتے وقت مجھے مولانا محمد سلیم الدین شمسی صاحب مدیر مقام رسالت نے' اصطفا خاں صاحب کا ایک خط اصطفا منزل کے انچارج کے نام دے دیا تھا کہ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو اصطفا منزل میں ٹھہرنے کا موقع دیا جائے۔ یہاں پہنچ کر اس خط کی ضرورت پیش آئی لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ وہ خط ہمارے ایک ساتھی سے گم ہو گیا ہے۔ اگرچہ ہم اپنی غفلت سے اصطفا منزل سے فائدہ نہ اٹھا سکے تاہم خاں صاحب کے لطف و کرم کا شکریہ واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مہربانی کے لیے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حکیم صاحب ساتھیوں کو لے کر مکان کی تلاش میں نکلے اور میں سامان کے پاس بیٹھا۔ معلم صاحب سے گفتگو کی تو انھوں نے خود اپنے مکان کے ایک حصے کی پیش کش کی۔ مکان تو وہ آرام دہ تھا اور معلم صاحب نے کوئی مول تول بھی نہیں کیا لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ اگر اس مکان میں ہم ٹھہرے تو بڑے اخلاقی دباؤ میں آ جائیں گے اور روپے بھی زیادہ خرچ کرنے پڑیں گے۔ اتنے میں میرے ایک قدیم ہم وطن' حافظ فصیح اللہ صاحب' جو مجھ سے غائبانہ واقفیت رکھتے تھے آ گئے۔ یہ اب ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں

مستقل مقیم ہو گئے ہیں اور مسجد نبوی کے پاس جو یتیم خانہ ہے اس میں ملازم ہیں۔ یہ فوراً مکان کی تلاش کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد بالکل پاس ہی ایک مکان کا پتہ دیا۔

اتنے میں حکیم صاحب بھی ایک مکان کا معاملہ طے کر کے واپس آ گئے۔ مگر شرط یہ تھی کہ میں بھی اس کو دیکھ کر پسند کر لوں۔ میں اگرچہ اس قسم کے انتظامی امور سے حتی الامکان بچنا چاہتا تھا لیکن حکیم صاحب کے اصرار سے مجھے اس مکان کو دیکھنے کے لیے جانا پڑا۔ میں اس مکان میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی سرنگ میں داخل ہو رہا ہوں۔ جس حصے میں ہمیں ٹھہرنا تھا وہ حصہ دیکھا تو وہ بھی عجیب سا معلوم ہوا۔ اوپر نظر اٹھائی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں کسی کارخانے کی چمنی کے نیچے کھڑا ہوں جہاں سے ذرا ذرا آسمان نظر آتا ہے۔ اس کے ہر حصے میں مسافر بھرے ہوئے نظر آئے جو تہذیب و معاشرت میں ہم سے بالکل مختلف معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس مکان کو ناپسند کر دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ حکیم صاحب کو بھی یہ مکان پسند نہیں تھا لیکن انہوں نے چاہا کہ اس کے خلاف ناپسندیدگی کے اظہار کی ذمہ داری ان کے بجائے میں اٹھاؤں۔ "حکمت عملی" کہاں نہیں چلتی!

بالآخر ہمیں اسی مکان کے حق میں فیصلہ دینا پڑا جس کا پتہ حافظ فصیح اللہ صاحب نے دیا تھا۔ یہ مکان نیا بنا ہوا تھا۔ صاف ستھرا اور ہوادار کمرے کھلے کھلے تھے۔ رات میں سونے کے لیے کھلی چھت تھی جہاں سے مسجد نبوی کے مینارے نظر آتے تھے اور اذانوں اور تکبیرات کی آوازیں بھی آسانی سے یہاں پہنچتی تھیں۔ جس مکان میں اتنی ساری خوبیاں ہوں اس کے کرائے کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میری اور حکیم صاحب دونوں کی یہی رائے قرار پائی کہ اس شہر میں چند دن گزارنے کا اللہ تعالیٰ نے موقع عنایت فرمایا ہے تو مکان پر سکون اور ماحول اچھا ہونا چاہیے۔

روضہ اقدس پر حاضری

مکان ملتے ہی ہم نے سامان اس میں منتقل کرایا اور نہا دھو کر مسجد نبوی اور روضہ اقدس کی حاضری کے لیے تیار ہو گئے۔ اب ظہر کا وقت قریب ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے جس وقت ہم مسجد نبوی میں داخل ہوئے مسجد کا اگلا حصہ نمازیوں سے رک چکا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہم روضہ اقدس تک پہنچ سکے۔ نفل پڑھنے کے لیے بھی بہ ہزار دقت جگہ مل سکی۔ روضہ اقدس کی جالیوں کے سامنے بھی بڑا ہجوم تھا۔ لوگ نہایت بلند آواز سے سلام پڑھ رہے تھے جس سے خاصا شور پیدا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب تو صاحب عزیمت ہیں وہ کہیں بھی افضلیت کو قربان کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی طلب کے مطابق ان کے لیے راہ بھی کر دیتا تھا لیکن میں نے اپنے لیے اسی کو بسا غنیمت جانا کہ اس بزم قدس میں باریابی تو ہو گئی' اس سے کیا بحث کہ کہاں جگہ ملی۔ مجھے جب اندازہ ہو گیا کہ اب میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مواجہہ میں حاضر ہو چکا ہوں تو میری نگاہیں خودبخود ادب سے جھک گئیں اور میں نے سلام پڑھا۔ لیکن سلام پڑھتے ہوئے بار بار میری زبان پر درود شریف کے الفاظ جاری ہو جاتے۔ ممکن ہے یہ عادت کا غلبہ ہو یا اس کا سبب یہ ہو کہ میں نے مدینہ شریف کے لیے روانہ ہونے کے وقت ہی سے دوسری دعاؤں میں تخفیف کر کے درود شریف کی تکثیر کر دی تھی۔ میرے پاس جن دوستوں کے سلام امانت تھے میں نے ان کی امانت بھی ادا کی۔ میں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو یہاں زار وقطار روتے دیکھا۔ حکیم صاحب کو بھی دیکھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں۔ مجھے ان کی رقت قلب پر اس سفر میں بار بار رشک آیا تھا لیکن اس موقع پر تو واقعی ان کی حالت قابل رشک تھی۔ میں نے اپنا حال دوسروں سے کچھ مختلف پایا۔ پہلے وہلہ میں تو میری پلکیں ذرا سی بھیگ گئیں جیسے کسی نہایت ہی غیر معمولی خوشی کے جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر ایک گریہ مسرت کی حالت طاری ہو گئی ہو۔ پھر برابر جب تک مواجہہ شریف میں حاضر رہا رعب اور دہشت کی جگہ ایک عمیق اعتماد کی حالت طاری رہی بلکہ اگر میں اس

حالت کو تذلل کے لفظ سے تعبیر کروں تو شاید یہ لفظ میری اس وقت کی حالت کو بہتر طریقہ سے تعبیر کر سکے۔

اس کے بعد حضرات شیخین کی قبروں کے سامنے ذرا ذرا دیر کے لیے رکنے کا موقع نصیب ہوا۔ جب میری زبان سے صدیق اکبر کی قبر پر دعا کے یہ الفاظ نکلے کہ اے رب تو ان کو ہماری طرف سے ان کی ان عظیم خدمات کا صلہ دے جو انھوں نے اسلام کی انجام دی ہیں تو واقعی میرا دل امنڈ آیا اور میں اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ حضرت فاروق اعظم کی قبر کے سامنے جب میں کھڑا ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جوش عقیدت و محبت کی گرمی سے میرا دل پگھل کر بہہ جائے گا۔ میں نے ان کی قبر پر خاص طور پر یہ دعا بار بار کی کہ اے رب تو نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور اسلام کی سربلندی کے لیے ان کی روح کو ہمارے اندر پھر بیدار کر دے!

اب نماز ظہر کے لیے اذان ہو چکی تھی اس وجہ سے ہمیں جہاں جہاں جگہ مل سکی ہم نماز کی صفوں میں جا شامل ہوئے۔ یہ اس مسجد میں ہماری پہلی نماز تھی جس کے چپے چپے پر ہمارے رسول اور ان کے صحابہ کے سجدوں کے نشانات ثبت ہیں۔

دس دن مدینہ منورہ میں

مدینہ منورہ میں حجاج کے قیام سے متعلق سعودی حکومت کی عام پالیسی یہ ہے کہ وہ دس دن سے زیادہ وہاں کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ بیک وقت اتنی تعداد میں وہاں حجاج کو جمع نہیں ہونے دینا چاہتی جس سے شہری زندگی کا سارا نظم و نسق متاثر ہو جائے۔ انتظامی نقطہ نظر سے تو اس چیز پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس انتظام سے جذبات کی حق تلفی تھوڑی سی ضرور ہوتی ہے۔ جو لوگ دس دن سے زیادہ مدت کے لیے جوار نبوی میں ٹھہرنا چاہتے ہیں وہ اپنی یہ تمنا پوری نہیں کر پاتے اور اگر وہ پوری کرنے پر مصر ہی ہوتے ہیں تو انھیں اس کے لیے معلمین سے سودا کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے اس معاملے میں فیصلہ کیا کہ ہم حکومت کے ایک صحیح انتظام میں غلط طریقے سے مداخلت نہیں کریں گے اور قانون کو اپنے شخصی جذبات پر ترجیح دیں گے۔

مسجد نبوی میں حاضری

دس دن قیام کا فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے مسجد نبوی میں حاضری کا اسی طرح کا پروگرام بنا لیا جس طرح کا پروگرام مکہ معظمہ میں حرم کی حاضری کے لیے بنا لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد نبویؐ میں آٹھ نو کے درمیان اور پھر عصر و مغرب کے درمیان ازدحام کسی قدر کم ہوتا ہے۔ چنانچہ معروف اوقات کے علاوہ یہ دونوں وقت بھی میں نے مسجد نبوی کے لیے خاص کر لیے۔ عشا اور مغرب کے درمیان کا وقت بھی میں عموماً وہیں گزارتا۔ کنکریوں والے پلاٹوں میں کسی پلاٹ میں جا بیٹھتا اور عشا کی نماز تک وہیں بیٹھا رہتا۔ اس کے ہر پلاٹ میں عموماً اس وقت کوئی نہ کوئی صاحب وعظ فرماتے ہوتے' اس

وجہ سے دل جمعی اور یکسوئی تو مشکل سے حاصل ہو پاتی لیکن میں اسی کو غنیمت سمجھتا کہ یہ لمحات مسجد نبوی میں گزر جاتے ہیں۔ یہ وعظ کرنے والے حضرات مصر' شام' پاکستان' بھارت غرض مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے ہوتے' مگر میں ان وعظوں سے بہت کم مستفید ہو سکا۔ صرف ایک روز ایک عالم کا وعظ تھوڑی دیر سننے کی کوشش کی۔ یہ غالباً تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے تھے۔ ان کے وعظ میں سنجیدگی اور تاثیر تھی۔ میں اپنا یہ وقت زیادہ تر نوافل یا درود شریف پڑھنے میں گزار تا۔

اللہ تعالیٰ سلطان ابن سعود مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جن کے ذوق و شوق اور جن کی زرپاشیوں سے مسجد نبوی شان' عظمت اور حسن کا ایک مرقع بن گئی ہے۔ ماہر انجینئروں نے اس کی تعمیر میں جدید و قدیم دونوں طرز تعمیر کی ساری خوبیاں جمع کر دی ہیں اور اس کی ہر چیز شہادت دیتی ہے کہ اس کے ہر کام پر دل کھول کر روپیہ بہایا گیا ہے اور سڑک کے کناروں پر نئے طرز پر بنی ہوئی اور سرو سامان سے سجی ہوئی دکانیں ہیں۔ دروازے متعدد ہیں اور ہر دروازہ نہایت شاندار اور کشادہ ہے۔ سامنے کے دروازوں میں سے ایک دروازے کا نام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نام پر ہے۔ یہ نام تو بہر حال محض تیمناً حضرت عمر کے نام پر رکھا گیا ہو گا' لیکن مجھے پہلے ہی دن سے اس دروازے سے کچھ انس سا ہو گیا۔ میں بیشتر اسی دروازے سے داخل ہوتا اور اسی سے نکلتا۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے کبھی کبھی میں اس مسجد نبوی کے تصور میں غائب ہو جاتا جو کھجور کے پتوں اور کھجور کے تنوں سے بنائی گئی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ کاش اس کے کسی گوشے میں وہ چھپا کر محفوظ کر دی گئی ہوتی تاکہ ہم اپنے ماضی اور حاضر دونوں کا موازنہ کر سکتے۔

روضہ اقدس پر

روضہ اقدس پر صبح و شام مناسب اوقات میں سلام کے لیے حاضر ہوتا اور وہی سلام پڑھتا جو عام طور پر ثقہ لوگوں سے منقول ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ انشراح حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ دل کے اس انقباض کو میں نے اپنی طبیعت کی کثافت اور اپنی

نااہلیت پر محمول کیا۔ بالآخر ایک روز ادب کے ساتھ سلام کرتا ہوا مواجہہ شریف کے بجائے حضور کے پائنتیں کی طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے رب تو میرے دل کو نفاق کی ہر آلائش سے پاک کر' اگر یہاں سے میں محروم لوٹا تو پھر کس در سے پانے کی امید کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد عادت کے غلبہ کی وجہ سے میری زبان پر درود شریف جاری ہو گیا۔ میں بڑی دیر تک درود شریف پڑھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس چیز سے میرا دل کچھ کھل سا گیا۔ اس کے بعد میں نے معمول بنا لیا کہ جالیوں کے سامنے حاضر ہو کر مختصر سلام عرض کرتا اور پھر پائنتیں کی طرف جا کر کھڑا ہو جاتا اور درود شریف پڑھتا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میری طبیعت کو اسی چیز سے زیادہ مناسبت ہے۔ اور اس دربار میں اس گناہ گار امتی کی جگہ یہی ہے۔

جنت البقیع میں

اس دوران میں جنت البقیع میں بھی حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جنت البقیع میں عورتوں کو جانے کی سعودی حکومت نے ممانعت کر رکھی ہے اس وجہ سے میری اہلیہ اس میں نہ جا سکیں۔ اپنی اس محرومی کا ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا عورتوں کا قبروں پر جانا شریعت میں ممنوع ہے؟ میں نے کہا' ممنوع تو نہیں ہے لیکن یہ نجدی حضرات اس معاملے میں بڑے متشدد واقع ہوئے ہیں' اس وجہ سے صبر کرو اور باہر ہی سے فاتحہ پڑھ لو۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ سارے دوران قیام مدینہ میں اپنی اس محرومی پر بہت دل گرفتہ رہیں۔ ان کو ازواج مطہرات' بنات طاہرات اور صحابہ و صحابیات کی قبروں پر حاضر ہونے کا بے انتہا شوق تھا' اس شوق کو پورا نہ کر پانا ان پر بڑا شاق گزرا۔ آخر ان بزرگوں کی برکات میں ان خواتین کا بھی تو برابر کا حصہ ہے' پھر ان کو ان کے حصہ سے محروم کرنے کی کوشش کیوں کی جائے؟

جنت البقیع کی حالت دیکھ کر میرے دل پر بڑا صدمہ گزرا۔ مجھے یہ علم تو پہلے سے تھا کہ نجدی فوجوں نے اپنے غلبہ کے ابتدائی دور میں تمام قبریں زمین کے برابر کر دی تھیں

لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ سرے سے قبروں کے نشانات ہی مٹا ڈالے گئے ہیں۔ سارا قبرستان بس ایک تودہ خاک کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بہت کم قبریں ایسی ہیں جن کے کچھ نشانات موجود ہیں۔ ان پر بھی چونکہ کتبے اور تختیاں وغیرہ لگانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ فلاں نشان کس کی قبر کا ہے' بے خبر معلموں کے بیان ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اس قبرستان میں امت کے گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں۔ اس کی خاک کے نیچے وہ لوگ محو خواب ہیں جن سے زیادہ پاک اور پاکیزہ لوگ ان کے بعد اس زمین کی پشت پر نہ کبھی چلے ہیں اور نہ کبھی چلیں گے' اس کے پردوں میں وہ لوگ چھپے ہوئے ہیں جن کے چہروں سے زیادہ نورانی چہرے چشم فلک نے نہ دیکھے نہ کبھی دیکھے گی۔ ایسے لوگوں کی قبروں کا اس طرح بے نشان ہو جانا طبیعت پر بڑا شاق گزرتا ہے۔

جو مسلمان صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم کے حالات اور ان کی سیرتوں کو کتاب میں پڑھے ہوئے ہے اور اسلام کے لیے ان کی بے مثال جان بازیوں اور قربانیوں سے واقف ہے اس کو ان میں سے ہر صحابی یا صحابیہ قبر ان کے اس خاص کردار کو یاد دلاتی ہے جو ان کی زندگی میں نمایاں رہا ہے۔ اس نشان کو مٹا دینے کے معنی در حقیقت ایک عظیم کردار کی آخری محسوس نشانی کے مٹا دینے کے ہیں۔ میں قبروں کے معاملے میں ہرگز کوئی بدعت پرستانہ رجحان نہیں رکھتا۔ میں ان لوگوں کو بالکل فضول قسم کے آدمی سمجھتا ہوں جو کسی قبر پر کسی غیر شرعی مقصد کے لیے جاتے ہیں۔ میرے دوست حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب جانتے ہیں کہ ان معاملات میں میں ان سے کم "وہابی" نہیں ہوں۔ میں قبور اور اہل قبور سے کسی استعانت کو صرف اسلام ہی کے خلاف نہیں بلکہ عقل انسانی کے بھی خلاف سمجھتا ہوں۔ اسی طرح کسی قبر پر سجدہ کرنا یا سر جھکانا یا اس کو بوسہ دینا صرف اپنے رب ہی کی نہیں بلکہ اس شرف انسانی کی بھی توہین سمجھتا ہوں جس کا شعور میرے رب نے خود میرے اپنے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود میں قبروں کی افادیت بالخصوص اسلام کے اعاظم رجال کی قبروں کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں کہ جس وقت میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی

قبر پر حاضر ہوا ہوں اور مجھے یہ خیال آیا کہ یہ اُس عظیم انسان کی قبر ہے جس نے طاقت اور اقتدار رکھتے ہوئے بھی مظلومانہ شہادت کو ترجیح دی لیکن یہ پسند نہ فرمایا کہ اس کی ذات امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کسی خونریزی کا سبب بنے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس امت کی محبت اور خیر خواہی کا حقیقی مفہوم آج زندگی میں پہلی بار میرے سامنے آیا ہے۔ میرے نزدیک ان کی قبر اس دنیا میں ان کے اس کردار کا واحد محسوس نشان ہے اور ایک جاننے والے شخص کے لیے اس نشان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی حال ان تمام صحابہ اور صحابیات کی قبروں کا ہے جن کے کردار سے ہمارے کردار بنتے اور سنورتے ہیں۔ ہمیں ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے نہ کہ ان کو بے نشان کرنا چاہیے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام قبروں پر قبے وغیرہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن اسلام کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ قبریں بے نشان کر دی جائیں۔ بالخصوص ان لوگوں کی قبریں جن کے علم اور عمل سے دنیا نے ہدایت کے نشانات راہ پائے ہیں اور جن کی قبریں فی الواقع دوسروں کے زندہ وجودوں سے زیادہ زندگی بخش ہیں۔

جنت البقیع کے ساتھ یہ سلوک تو حکومت کا ہے' رہے عام حجاج اور زائرین تو ان کا سلوک بھی اس کے ساتھ میں نے کچھ اچھا نہیں پایا۔ میں نے اس میں جگہ جگہ انسانی بالوں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہوئے دیکھے۔ اوہام کے مریض زائرین ان بالوں کے تکیے بھر بھر کے لاتے ہیں اور نگرانوں کی آنکھیں بچا کے اس میں پھینک جاتے ہیں۔ میں یہ تحقیق نہیں کر سکا کہ اس ٹوٹکے کے پیچھے کیا وہم چھپا ہوا ہے' لیکن بظاہر یہ عورتوں کا کوئی ٹوٹکا معلوم ہوتا ہے۔ اب عورتوں کی آمد و شد تو جنت البقیع کے اندر بند ہے اس وجہ سے پاکوں کے اس قبرستان میں اس گندگی کے پھیلانے میں ان کی نمائندگی کا فرض ان کے مرد انجام دیتے ہوں گے۔ میں یہ اندازہ صحیح طور پر نہیں کر سکا کہ اس ٹوٹکے میں اہل پاکستان کا کتنا حصہ ہے خدا کرے اس میں ان کو کوئی حصہ بھی نہ ہو۔

میں نے دیکھا کہ بدعات اور اوہام کے مریض اس قبرستان میں نگرانوں کی آنکھیں بچا کے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ

جلدی جلدی زمین پر قبروں کی سی کچھ لکیریں کھینچ رہے ہیں میں نے ان کی اس حرکت کا جب فلسفہ معلوم کرنا چاہا تو مجھے بعض دوستوں نے بتایا کہ یہ لوگ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی قبروں کے نشانات بنا رہے ہیں' ان کا تصور یہ ہے کہ جن جن کی قبروں کے نشانات اس مقدس قبرستان میں وہ بنا جائیں گے' قیامت کے دن وہ سارے لوگ اسی قبرستان سے اٹھیں گے۔ ایک یمنی بزرگ نے لوگوں کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو ایک طنز آمیز ہنسی کے ساتھ انھوں نے فرمایا کہ لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا اگر وہ اردو میں اپنا مدعا کہتے تو غالباً یہ شعر پڑھتے -

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اطراف شہر کی زیارت

یہاں مجھے اس بات کی آرزو نہایت شدید رہی کہ اس مبارک شہر کے ان حصوں کو دیکھوں جو اپنی صورت و ہیئت کے اعتبار سے عہد نبوت سے قریب تر ہو سکتے ہیں۔ مسجد نبوی کی زیارت سے تو یہ شوق پورا ہو نہیں سکتا تھا' مسجد نبوی تو' جیسا کہ عرض کر چکا ہوں بالکل ایک نیا قالب اختیار کر چکی ہے' اس کا پرانا حصہ جو اس نئی تعمیر میں باقی رہنے دیا گیا ہے وہ بھی ترکوں کے زمانے کا تعمیر کردہ ہے اور شاید اس وجہ سے باقی رہنے دیا گیا ہے کہ اپنے حسن اور استحکام کے لحاظ سے وہ جدید تعمیر کے ساتھ پوری طرح میچ کرتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے یہ سکیم بنائی کہ روزانہ شام کو روضہ اقدس پر حاضری کے بعد کسی نہ کسی طرف نکل جایا کروں۔ میں نے خیال کیا کہ اور کہیں نہیں تو اس شہر کے اطراف کے باغوں' اس کے جنگلوں اور کھیتوں' اس کے میدانوں اور اس کی جھاڑیوں میں تو اس عہد مبارک کی کچھ خوبو ہوگی ہی۔ چنانچہ اسی شوق میں نے مدینہ منورہ کا پرانا بازار بھی دیکھا۔ اور اسی شوق میں شہر کے قرب و جوار کی جھاڑیوں اور اس کے کھیتوں اور باغوں میں بھی پھرا حالانکہ اس گرم ملک میں تھوڑی دور چلنے سے بھی آدمی تکان اور پیاس محسوس کرنے لگتا ہے۔ سواری اس ملک کے شہروں میں اب اگر کوئی ہے تو موٹروں کی

ہے۔ اس سے نیچے درجے کی ساری سواریاں یہاں اب منسوخ ہو چکی ہیں اس وجہ سے کہیں جانا ہو تو یا تو ٹیکسی لیجیے ورنہ پیدل قسمت آزمائی کیجیے۔ عربی گھوڑے جن کی عربی لٹریچر میں ہم نے بڑی تعریفیں پڑھی تھیں یہاں کے شہروں سے تو کم از کم اس طرح غائب ہیں کہ گویا سرے سے ان کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہا ہے۔ گھوڑے تو گھوڑے اونٹ بھی اب کم ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کو گدھے پر بڑے ٹھسے سے سواری کرتے دیکھا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کے گدھے بڑے چنچل اور بڑے صبا رفتار ہوتے ہیں لیکن یہ بھی غالباً اب کرائے پر نہیں ملتے بلکہ بعض باہر کے آنے والے لوگ اپنی سواری کے لیے لاتے ہیں۔

یہاں ایک آسانی یہ ہے کہ آپ مسجد نبوی سے نکل کر جنت البقیع کی طرف چلے جائیے تو گویا آپ شہر سے باہر آ گئے۔ یہاں سے کھجور کے باغوں' کھیتوں اور جھاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک روز ہم ایک بٹیا سے گزر رہے تھے کہ بچوں اور بچیوں نے مل کر خیر مقدم کے گیت گانے شروع کر دیے۔ اگرچہ اس طرح کے خیر مقدم کے گیت ساحل جدہ پر اترنے کے بعد سے میں نے بارہا سنے تھے لیکن مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ یہ چیز مجھے عرب قوم کی خودداری کے خلاف معلوم ہوئی کہ اس کے بچے اور بچیاں محض چند ٹکوں کے لیے یہ سائلانہ انداز اختیار کریں۔ لیکن مدینہ منورہ کے بچوں اور بچیوں کی زبان سے جب میں نے یہ نغمہ سنا تو فوراً میرے حافظے میں اس نغمہ خیر مقدم کی یاد تازہ ہو گئی جو حضور کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے موقع پر اس شہر کی بچیوں نے گایا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ان معصوموں کی لے میں کچھ نہ کچھ مشابہت تو ان معصوموں کی لے کی ضرور ہی ہو گی۔ چنانچہ واقع یہ ہے کہ میں نے پہلی بار ان کے اس گیت کو بہت توجہ سے سنا اور میرے کان اب تک اس کی حلاوت محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دن اپنی اسی سیر کے سلسلے میں ایک باغ میں چلا گیا۔ باغ کسی اچھے زمیندار کا معلوم ہوتا تھا۔ ٹیوب ویل سے پانی نکالا جا رہا تھا۔ کھجوروں کے درخت نہایت شاداب

تھے۔ باغ گھنا تھا اور شادابی حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ باغ پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ درختوں پر کھجوروں کے بڑے بڑے خوشے دیکھ کر زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ کھجور کا پھلنا کس چیز کو کہتے ہیں۔

نالیوں میں شفاف پانی بہتا ہوا دیکھ کر میں اس کو پینے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ پاس ہی ایک مزدور کھڑا تھا۔ جس کی ہر چیز سے غربت اور فلاکت برس رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا' بھئی یہ پانی پیا بھی جاتا ہے۔ اس نے کہا ہاں پیا تو جاتا ہے لیکن آپ میرے ساتھ چلئے' میں آپ کو ٹھنڈا پانی پلاؤں گا۔ ہم اس کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں چلے گئے۔ کوٹھڑی کے سامنے ٹیوب ویل کا حوض تھا' اندر ایک جاجم بچھی ہوئی تھی' ایک دو تکیے بھی پڑے ہوئے تھے۔ عربی طرز کی ایک پیچوان بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی صراحی سے پانی انڈیل کر ہمیں دیا۔ پانی نہایت ٹھنڈا اور نہایت شیریں۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کو کچھ نذر کرنا چاہا' اس نے کہا اگر یہ پانی کا معاوضہ ہے تو نہیں۔ میں نے کہا یہ معاوضہ نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ ہدیہ کہنے کے بعد اس نے قبول کر لیا۔ انتہائی غربت کے باوجود اس کی یہ خوش سلیقگی اور خودداری ہمیں بہت پسند آئی۔ ہم اس کے حسن سلوک اور حسن اخلاق سے نہایت متاثر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں دو عورتیں پیچھے پڑ گئیں اور انہوں نے بخشیش کے لیے اس بری طرح ہمارا تعاقب کیا کہ ان سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اسی طرح ایک دن میں ایک اور باغ میں جا گھسا۔ وہاں ایک کسان کھیت کی مینڈ پر کھڑا تھا اور دو عورتیں کھیت سے سبزیاں بازار بھیجنے کے لیے نکال رہی تھیں۔ عورتوں کے چہروں پر برقعے تھے۔ کسان ہم سے خوش اخلاقی سے ملا۔ میں نے کھیت پر نظر دوڑائی تو مجھے دو سبزیاں کچھ غیر معروف سی نظر آئیں۔ ایک کے پتے کچھ پودینے کے پتوں سے ملتے جلتے تھے اور دوسری کچھ سبز لہسن سے مشابہ نظر آئی۔ میں نے اس سے ان دونوں سبزیوں کے نام پوچھے' اس نے مجھے ان دونوں کے نام بتائے جو اب مجھے یاد نہیں رہے۔ بس اس قدر یاد ہے کہ ان میں سے ایک کا نام کچھ بڑا ہی ہولناک قسم کا اس نے بتایا۔ شاید

"مخندوش" یا اس سے بھی کچھ زیادہ پرہیبت نام اس نے لیا۔ میں نے پوچھا یہ کچی حالت میں کھائی جاتی ہیں یا پکا کر۔ اس نے کہا کچی حالت میں۔ پھر اس کے کچھ پتے توڑ کر اس نے مجھے دیے اور کہا چکھ کر دیکھو۔ میں نے ان کو چکھ کر اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کے پتوں میں لہسن اور پیاز کی پتوں کی طرح کی کچھ تیزی ہے اور دوسرے کے اندر پودینہ سے مشابہ خوشبو اور طراوت۔

اسی طرح ایک روز میں ایک اور باغ کے اندر گھس گیا۔ یہاں ہر باغ کے اردگرد چہار دیواری ضرور ہوتی ہے۔ میں اس باغ کے اندر گھسنے کو تو گھس گیا لیکن باغ بہت بڑا تھا اور بالکل اجاڑ پڑا ہوا تھا۔ اس کا پانی کا جو سسٹم تھا وہ بھی درہم برہم تھا۔ پیاس تو یہاں ہر چند قدم پر لگ جاتی ہے اس وجہ سے مجھے پیاس شدت کی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن کسی متنفس کی آہٹ میں نے نہیں پائی۔ اس وقت سچی بات یہ ہے کہ مجھے سخت وحشت ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ حضور کے زمانے میں یہود کے اسی طرح کے باغ پر خطر سمجھے جاتے رہے ہوں گے۔ آج بھی یہ شرعی حدود کے نفاذ کا فیض ہے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے ورنہ اس طرح کی جگہیں ہر قسم کے برے اقدامات کے لیے نہایت مامون ہیں۔ میں فوراً اس باغ سے نکل کر سڑک پر آگیا اور ایک دوسرے باغ میں جا کر پانی پیا تب کہیں جا کر گھر لوٹنے کے قابل بنا۔

آثار متبرکہ کی زیارت

ہمیں دس دنوں کے اندر ہی اندر مکہ معظمہ کو واپس جانا تھا۔ واپسی کی تاریخ قریب آ پہنچی تھی اس وجہ سے ضروری تھا کہ ہم دوسرے آثار متبرکہ ——— مسجد قبا' مسجد قبلتین ' اُحد' خندق وغیرہ کی زیارت سے بھی فارغ ہو جائیں لیکن حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اس دوران میں بیمار ہو گئے۔ اس وجہ سے یہ کام ٹلتا رہا۔ مدینہ منورہ میں اس زمانے میں انفلوئنزا کا کچھ اثر تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس سے متاثر پایا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے حکیم صاحب اس سے متاثر ہوئے۔ اگرچہ حکیم صاحب یونانی'

ایلو پیتھی' ہومیو پیتھی کا ایک پورا دواخانہ ساتھ لے گئے تھے۔ میرے ساتھ بھی حکیم اقبال حسین صاحب' ڈاکٹر سلیم الدین صاحب اور ڈاکٹر قیوم سعادت صاحب کی عنایت کردہ دواؤں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا لیکن وہاں کی آب وہوا کے تقاضوں کو کچھ وہیں کے طبیب اور ڈاکٹر سمجھتے ہیں چنانچہ ایک حکیم صاحب نے جو اب مدینہ میں رہ پڑے ہیں' ان کا علاج کیا اور اس سے ان کو فائدہ پہنچا۔ واپسی کی تاریخ سے دو ایک دن پہلے حکیم صاحب اٹھ بیٹھے اور ہم ایک روز تمام آثار متبرکہ دیکھ آئے۔

سیدالشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مزار احد کے دامن میں ہے۔ یوں تو سیدالشہدا کی ہر بات یاد رکھنے کے قابل ہے لیکن ان کی ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ یہ کہ جب ان کو خبر دی گئی کہ ابوجہل نے ان کے بھتیجے کی توہین کی ہے تو ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ فوراً ابوجہل کے پاس پہنچے اور بولے کہ تو نے جس دین کی بنا پر میرے بھتیجے کی توہین کی ہے اس دین کا اعلان اب میں کرتا ہوں' تجھے جو کچھ کرنا ہے وہ کرلے۔ حق کی حمیت و حمایت کے لیے یہ کیرکٹر ایک مثالی کیرکٹر ہے۔ سیدالشہدا کی قبر پر آدمی جب پہنچتا ہے تو ان کی سیرت کے اس پہلو کا خیال آتے ہی دل جوش محبت سے اچھلنے لگتا ہے۔ میں نے ان کی قبر پر اپنے لیے یہ دعا کی کہ اے رب تیرے رسول کے لیے حمیت و حمایت کا جو جوش و جذبہ سیدالشہدا کے سینہ میں تھا وہ جوش وجذبہ تو میرے سینے میں بھی پیدا کردے۔

یہاں پولیس کا جو آدمی نگرانی پر مامور تھا اس سے میری ہلکی سی جھڑپ ہوگئی۔ میری اہلیہ نے فاتحہ اور دعا کے لیے قبر کے قریب جانا چاہا تو پولیس والے نے ان کو روکا۔ اس کے روکنے کا انداز کچھ ناتراشیدہ سا تھا' میں نے اس کو سختی سے ڈانٹا۔ میرے غصے کے جواب میں اس نے کسی غصے کے اظہار کی بجائے صرف اتنی بات کہی کہ ہم تو چند ہدایات کے ساتھ یہاں مامور ہیں' ہم ان ہدایات کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز آپ کی خواہشوں کے خلاف ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ مجھے اس کی یہ بات بہت معقول معلوم ہوئی اور مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اگرچہ بدعت پسند حاجیوں کی بے

قاعدگیوں سے تنگ آکر کبھی کبھی یہ لوگ اپنا تحمل کھو بھی بیٹھتے ہیں لیکن بالکل ناتراشیدہ نہیں ہیں بلکہ اپنے کام کے لیے تربیت پائے ہوئے ہیں۔

اسی طرح کا تجربہ مجھے ایک دن مسجد نبوی میں بھی ہوا۔ میری اہلیہ نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میں صفہ پر نفل پڑھنا اور اپنی لڑکیوں کے مدرسے کے لیے دعا کرنی چاہتی ہوں۔ اتفاق کی بات کہ جس وقت انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی صفہ مردوں سے تقریباً خالی تھا۔ میں نے ان سے کہا بسم اللہ' دو رکعت پڑھ کے جو دعا مانگنی ہے مانگ لو۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ صفہ پر عورتوں کو جانے کی ممانعت ہے۔ ایک حبشی خادم مسجد نے جب ایک عورت کو صفہ پر نماز پڑھتے دیکھا تو وہ بھاگا ہوا آیا اور میری اہلیہ کو جب کہ وہ نماز پڑھ رہی تھیں سخت سست کہنے لگا اور اپنے عام طریقہ کے مطابق چاہا کہ ان کو وہاں سے عین حالتِ نماز میں اٹھا دے۔ مصر' شام' حبشہ اور یمن کی خواتین کے ساتھ میں نے ان کا یہ درشت رویہ بارہا دیکھا تھا اور اس سے مجھے بڑی تکلیف تھی۔ چنانچہ جب وہ قریب آیا تو میں نے اس کو سختی سے روکا اور کہا کہ ان کو نماز ختم کرلینے دو۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی پہنچ گیا اس نے کہا عورتوں کے لیے یہاں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ میں نے کہا کس نے منع کیا ہے' کیا خدا اور رسول نے؟ اس پر وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور بولا کہ ہم تو حکومت کی طرف سے مامور ہیں۔ میں نے کہا' میں نے آپ لوگوں کا جو رویہ خواتین کے ساتھ دیکھا ہے وہ قابل اعتراض ہے۔ میں اس کو حکومت کے نوٹس میں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اتنے میں ایک اور بزرگ نے بیچ میں مداخلت کی اور بڑے شائستہ انداز میں ان لوگوں کی مجبوریوں کی طرف توجہ دلائی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مکہ معظمہ میں بھی اور مسجد نبوی میں بھی خدام اور عورتوں کے درمیان ہر وقت ایک آنکھ مچولی سی ہوتی رہتی ہے۔ نمازوں کے اوقات میں خدام عورتوں کو مطاف میں یا روضہ اقدس پر جانے سے روکتے ہیں لیکن میں نے بہت سی مصری اور شامی خواتین کو دیکھا ہے کہ وہ ان کے روکنے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتیں۔ اگر کرتی بھی ہیں تو اس سے زیادہ نہیں کہ اگر وہ ایک طرف سے روک دی جاتی ہیں تو دوسری

طرف سے نظر بچا کے اسی جگہ پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں جس جگہ سے ان کو روکا جاتا ہے۔ اس طرح معاملہ اکثر اوقات سخت کلامی تک پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات خدام اپنی وہ چھڑیاں بھی استعمال کرتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں' بلکہ اس سے گزر کر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ شانے پکڑ پکڑ کر ان عورتوں کو دھکے دیتے اور روکتے ہیں۔ میرے لیے اس صورت حال کا مشاہدہ سخت تکلیف دہ رہا۔ کبھی مجھے ان خواتین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ آتا اور کبھی خدام کی زیادتی اور بے اعتدالی پر۔ میرے نزدیک اس صورت حال کی اصلاح ضروری ہے اور میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تجویز آگے چل کر پیش کروں گا۔

ایک دلچسپ واقعہ

ایک روز ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہم مسجد نبوی میں مغرب کے بعد بیٹھے تھے کہ بجلی دفعتاً گل ہو گئی۔ بجلی کا گل ہونا تھا کہ مسجد نبوی کا وہ حصہ جو خواتین کے لیے مخصوص ہے (اور وہ تقریباً آدھا ہے) تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی مقرر کے کسی پرزور فقرے پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی ہو۔ مجھے اس واقعہ پر سخت حیرانی ہوئی۔ مسجد نبوی کے اندر یہ تالی پیٹنے کی جسارت کون لوگ کر سکتے ہیں؟ ہمارے زمانہ قیام میں بیشتر زائرین مصر اور شام سے تعلق رکھنے والے تھے۔ قدرتی طور پر خواتین میں بھی اکثریت مصر اور شام ہی کی خواتین کی تھی۔ میں مصر اور شام کی خواتین کی آزادہ روی کا تو قائل ہوں لیکن یہ گمان نہیں رکھتا تھا کہ وہ اپنی اس آزادی کے لیے مسجد نبوی کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیں گی۔ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو میں نے بعض لوگوں سے اس واقعے کا ذکر کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مصر و شام کی خواتین جب بجلی کبھی گل ہو جاتی ہے تو اسی طرح تالی بجا کر اس کو بلایا کرتی ہیں۔ یہ بات کچھ میرے دل کو نہیں لگی۔ میں حیران ہوا کہ اس طرح کے کسی واہمہ پر اس درجے کا ادعا ان لوگوں کو کس طرح ہو سکتا ہے کہ ادب و احترام کی اس سب سے بڑی جگہ میں

بھی وہ طبائع پر غالب ہو جائے۔ بالآخر ایک روز میرا یہ شک دور ہو کے رہا۔ عرفات سے مزدلفہ واپس ہوتے ہوئے ایک مرتبہ ہماری بس کی روشنی گل ہو گئی۔ میرے قریب ایک مصری بچی بیٹھی ہوئی تھی۔ روشنی کا گل ہونا تھا کہ اس نے فوراً تالی پیٹ پیٹ کر روشنی کو بلانا شروع کر دیا۔ روشنی کو بلانے کا انداز اس کا بڑا معصومانہ تھا۔ تین مرتبہ تالی بجاتی اور پھر اپنے دہنے ہاتھ کو اوپر کی طرف لے جا کر اس طرح نیچے کی طرف لاتی گویا روشنی کو رہنمائی دے رہی ہے کہ یوں آ جا۔ اس معصوم بچی کی اس معصومانہ ادا نے میری ایک بہت بڑی الجھن دور کر دی اور خدا ڈرائیور کا بھی بھلا کرے کہ اس نے اسی اثنا میں سوئچ آن کر دی اور بچی خوش ہو گئی کہ اس کا جادو کامیاب رہا۔

ملاقاتیں

یہاں میرا ملنا جلنا لوگوں سے بس برائے نام ہی رہا۔ حکیم صاحب بھی بیمار ہو جانے کے سبب سے کچھ زیادہ ہیرا پھیری نہ کر سکے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اب اہل سیاست ہوں یا ارباب علم و مذہب سب یا تو مکہ معظمہ اور جدہ میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں یا ریاض میں۔ مدینہ منورہ میں تو وہی شخص اب رہنا پسند کرتا ہے جسے دنیا سے کوئی تعلق نہ رہ گیا ہو۔ دور خلافت راشدہ میں تمام علم اور تمام دین کا مرکز اور منبع یہی شہر تھا۔ اس شہر کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ عمل اہل مدینہ فقہ مالکی میں ایک حجت شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے امام اہل مدینہ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی قبر پر ان کا یہ اصول یاد آیا اور اس بات سے سخت صدمہ ہوا کہ جس شہر سے ساری دنیا کو ہدایت و رہنمائی ملی اب اگر وہاں کوئی صاحب کمال ہے بھی تو کسی گوشہ گمنامی میں ہے۔

یہاں میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ اگر کسی درویش عالم کا پتہ چلا تو اس کی زیارت کو ضرور جاؤں گا لیکن حکیم صاحب کی علالت نے یہ خواہش پوری ہونے نہ دی۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ دھوپ میں یہاں باہر نکلنے کی ہمت ہوتی نہیں اور سواریوں کا یہاں جو حال ہے اس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ اسی مشکل کی وجہ سے مولانا شاہ بدر عالم

صاحب سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ حالانکہ مجھے ان سے نہ صرف خود دیرینہ اشتیاق ملاقات تھا بلکہ میرے دوستوں میں سے شیخ سلطان احمد صاحب اور سردار محمد اجمل خان صاحب لغاری نے ان سے ملنے کی مجھے تاکید بھی کی تھی۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ اس عاجز سے خود بھی ملاقات کی خواہش رکھتے ہیں۔ ایک دن خاص طور پر وقت نکال کر ان کے دولت خانہ پر حاضر بھی ہوا تو وہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔

بھارت اور پاکستان کے کچھ جاننے والے میری قیام گاہ پر کسی کسی وقت آجاتے' ان سے ملاقات ہو جاتی۔ میرے ایک قدیم ہم وطن حافظ فصیح اللہ صاحب' جن کا ذکر اوپر کہیں گزر چکا ہے' بہ اصرار کئی مرتبہ اپنے مکان پر لے گئے اور پھلوں سے تواضع کی۔ ایک شامی عالم جن کا نام مجھے افسوس ہے کہ یاد نہیں رہا' ہمارے ہاں کئی بار تشریف لائے۔ ان سے مصر و شام کے اتحاد کے مسائل پر گفتگوئیں رہیں۔ نہایت دین دار' متواضع اور بے تکلف آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن عرب قومیت کے بڑے علم بردار تھے۔

روانگی کے وقت کا ایک خاص تاثر

دس دن کی مدت ہی کیا ہوتی ہے' دل کا کوئی ارمان بھی ابھی پورا نہیں ہو پایا تھا کہ واپسی کی تاریخ آگئی۔ اس دوران میں ایک خلش نے میرے دل کو برابر پریشان رکھا۔ وہ یہ کہ میں نے بہتوں کو دیکھا کہ ان کے دل کی حالت میرے دل کی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ وہ روضہ اقدس پر حاضر ہوتے ہیں تو ان کی آنکھیں شہادت دیتی ہیں کہ ان کے سینوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی گرمی موجود ہے۔ میں اپنا حال یہ نہیں پاتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں حضور کی محبت خدانخواستہ اپنے دل کے اندر نہیں محسوس کرتا تھا' محسوس تو بہت کچھ کرتا تھا' کبھی کبھی تو ایسی کیفیت محسوس کرتا تھا کہ جی چاہتا کہ روضہ اقدس کے سامنے دل کو نچوڑ کے رکھ دوں لیکن آنکھوں کی راہیں کچھ کچھ بند بند سی محسوس کرتا تھا۔ دس دن کی مدت اسی ذہنی اور قلبی الجھن میں گزر گئی۔ مجھے اندر اندر یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ یہ حالت دل کی سختی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ روانگی کے

دن میرا یہ احساس بہت شدید ہو گیا۔ میں جب وداعی سلام کے لیے حاضر ہوا ہوں تو اپنے اس احساس کے سبب سے اس قدر دل شکستہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی اب ہر ارمان اور ہر حوصلہ سے بالکل خالی ہو گئی ہے۔ میں جب مسجد نبوی میں حاضر ہوا تو اس وقت ازدحام نہیں تھا۔ میں نے روضہ جنت میں نفل پڑھی اور سجدے میں دعا کی کہ اے رب میں تیرا گناہ گار بندہ اور تیرے نبی کا گناہ گار امتی ہوں' اگر تو نے مجھ پر یہ فضل فرمایا کہ میں تیرے ان مقدس اور پاک گھروں میں حاضری دے سکا تو یہ مجھے یہاں سے محروم نہ واپس کر' میں اس زندگی میں یہ سعادت پھر حاصل کر سکوں گا یا نہیں اس کو تو ہی جانتا ہے اور یہ چیز تیرے ہی اختیار میں ہے' اپنے غلام پر رحم کر اور میرے دل کی حالت بدل دے۔ اگر میں تیرے اس دروازے سے بھی محروم لوٹا تو وہ کون سا دروازہ ہے جہاں میں کوئی امید لے کر جا سکتا ہوں۔ اللھم انی اعوذ برضاك من سخطك وبمعافاتك من عقوبتك واعوذ بك منك لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔

اس دعا کے بعد آخری سلام کے لیے حاضر ہوا۔ مواجہ شریف میں پہنچا تو بس سلام کا پہلا ہی کلمہ زبان سے ادا ہو پایا تھا کہ دفعتاً محسوس ہوا کہ دل کے اندر ایک بند تھا جو ٹوٹ پڑا ہے اور آنکھوں سے ایک طوفان ہے جو ابل پڑا ہے۔ میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ دیوار سے سہارا لے کر دوزانو بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب رخصت ہونا چاہا تو دل کسی سلام کو بھی آخری سلام ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ چند قدم دروازے کی طرف بڑھوں تو دل پھر مجبور کرے کہ ایک مرتبہ حضور کو اور سلام کر آؤں۔ یہ سعادت پھر اس زندگی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ بڑی دیر کے بعد جب اس کشمکش سے چھوٹا تو اسی طرح کی کشمکش سے مسجد نبوی کے دروازے سے نکلتے ہوئے دوچار ہوا۔ جب قدم باہر نکالوں اور یہ خیال آئے کہ معلوم نہیں اب اس گھر میں پھر داخل ہونا نصیب ہو یا نہ ہو تو دل بیٹھنے لگ جائے۔ مگر اس زندگی میں ہمیشہ دل ہی کی نہیں چلتی۔ آخر مجبور ہو کر مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اور روضہ اقدس سے جدا ہونا ہی پڑا۔

مکہ معظمہ کو واپسی

لاری مسجد نبوی کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ روانگی کا معینہ وقت گزر چکا تھا مگر معلم صاحبان کی بے قاعدگی نے ایک ایسا الجھاؤ پیدا کر دیا تھا کہ کوئی شکل اس کے روانہ ہونے کی بنتی ہی نہیں تھی۔ جتنے آدمی اس لاری سے جا سکتے تھے معلم صاحبان نے اس سے زیادہ آدمیوں کو اس سے بھیجنے کے وعدے دے رکھے تھے۔ یہ سارے ہی آدمی آدھمکے۔ ان کا سامان بھی زیادہ اور ان کی تعداد بھی زیادہ۔ حجاج کی لاریوں کے لیے یہ ضابطہ ہے کہ نہ وہ زیادہ سواریاں اٹھا سکتی ہیں نہ کم۔ معلم صاحبان اگر کسی قافلے کے دو چار آدمیوں کو کم کرنا چاہیں تو پورا قافلہ صدائے احتجاج بلند کرے۔ بڑی دیر تک ایک نہایت ناگوار بحث چلتی رہی۔ تعداد یا تو حد معتاد سے زیادہ ہو جائے یا کم' میزان برابر کسی طرح سے بھی ہونے میں نہ آئے۔ میرا یہ وقت بڑی ذہنی کوفت میں گزرا' البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک نماز مسجد نبوی میں ادا کرنے کا اور موقع مل گیا۔ بالآخر حکیم صاحب بیچ میں پڑے اور اس قضیے کے طے ہونے کی کوئی شکل نکلی۔ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم نے بادل پر غم وبادیدہ پر نم مدینتہ الرسول کو الوداع کہا۔

شہر سے باہر نکلتے ہی ڈرائیور نے بخشیش کا مطالبہ کیا۔ اس کا مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ عمرے کے لیے احرام تو ہم نے گھر سے ہی باندھ لیا تھا لیکن راستے میں بیر علی کے پاس' جہاں سے حضور نے حجتہ الوداع کے موقع پر احرام باندھا تھا' ذرا دیر کے لیے اترے' دو رکعت نفل پڑھی اور ارادے کی تجدید کر لی۔

پھر مکہ معظمہ میں

مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد ہم سب سے پہلے عمرے سے فارغ ہوئے۔ یہ عمرہ ہمارا دوسرا عمرہ تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی والدہ مرحومہ کی طرف سے عمرے کی نیت کی تھی اور میری اہلیہ نے اپنے والد مرحوم کی طرف سے۔ میں عمرے اور حج میں اسی طرح کی چند صورتوں میں کسی دوسرے کی طرف سے حج یا عمرے کا قائل ہوں۔

سعی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے حجامت بنوانی چاہی تو ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ میں اوپر کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ مناسک حج و عمرہ کے سلسلے کی حجامت سے متعلق میرا ارادہ یہ تھا کہ پہلے عمرے کے موقع پر قینچی سے سر کے بال ترشواؤں گا' دوسرے عمرے کے موقع پر مشین سر پر پھرا دوں گا' اور حج کے موقع پر پورا سر گھٹا دوں گا۔ یہ نقشہ میں نے اس خیال سے بنایا تھا کہ مجھے حلق اور تقصیر دونوں کا ثواب حاصل ہو سکے۔ اس نقشے کے مطابق قینچی کا مرحلہ تو گزر چکا تھا۔ اب باری مشین کی تھی۔ چونکہ یہاں حجامت بنانے والے زیادہ تر اناڑی ہوتے ہیں اس وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی اناڑی حجام غلط قسم کی مشین سے میرے سارے بال اکھاڑ کے نہ رکھ دے۔ میں نے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی اپنا وطنی حجام بلوایئے' میں کسی اجنبی کی مشین کے نیچے اپنا سر دے دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انھیں میری اس فرمائش کی تعمیل میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہیں آئی۔ لائل پور کی سرزمین بڑی مردم خیز ہے۔ وہ فوراً ایک حجام کو بلا لائے اور کہا کہ یہ لائل پور کے رہنے والے ہیں اور تمہاری حجامت ٹھیک طرح سے بنا دیں گے۔ میں اس کامیابی سے بہت خوش ہوا اور مسعیٰ کے پیچھے ایک پتھر پر بیٹھ کر ان سے کہا کہ بسم اللہ۔ انہوں نے اپنا کام شروع کیا لیکن ابھی میرے آدھے ہی سر پر ان

کی مشین پھری ہو گی کہ ایک پولیس کا آدمی دفعتاً نمودار ہوا اور ان کی کسبت اٹھا کر چلتا بنا۔ پولیس والا آگے آگے اور غریب حجام خوشامد اور لجاجت کرتا ہوا پیچھے پیچھے۔ اب مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں حجامت کے لیے غلط جگہ پر بیٹھ گیا تھا اس وجہ سے پولیس والا حجام کو تھانے لیے جا رہا ہے۔ شیشہ میرے ہاتھ میں تھا' میں نے اس میں اپنی صورت جو دیکھی تو اس سوچ میں پڑ گیا کہ حجام تو تھانے گیا' اب اس ہیئت کذائی کے ساتھ میں کہاں سر چھپانے کی کوشش کروں۔ اگرچہ صورت حال خاصی الجھن میں ڈال دینے والی پیدا ہو گئی تھی لیکن ایک پہلو میرے لیے خوشی کا بھی تھا کہ پولیس والا حجام ہی کو تھانے لے گیا' اگر اسی حالت میں وہ مجھے بھی تھانے لے جاتا تو کیسی مشکل پیش آ جاتی!

لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں کے پولیس والے بڑے کریم النفس ہوتے ہیں۔ حجام کی تھوڑی سی خوشامد سے وہ رام ہو گیا اور اس کی کسبت اس نے اس کے حوالے کر دی۔ یہاں کسی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کا انداز بڑا پیارا ہوتا ہے۔ استمالت کے الفاظ بھی موثر ہوتے ہیں اور اس کا انداز بھی دلکش ہوتا ہے۔ باربار ٹھوڑی یا داڑھی پر ہاتھ لے جاتے ہیں اور اللہ اور رسول کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہاتھ جوڑنے یا پاؤں پر گرنے کی مذموم روش یہاں کے لوگ اختیار نہیں کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر درود بھی غصہ کو فرو کرنے کے لیے یہاں بڑی موثر چیز سمجھی جاتی ہے اور آدمی کے سینے میں ایمان ہو تو اس چیز کے موثر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

انفلوئنزا کا حملہ

میں جس وقت عمرے کے مناسک سے فارغ ہونے کے لیے سعی کر رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ میں اب بیمار پڑنے والا ہوں۔ گھر لوٹ کر میں نے اس حالت میں کچھ شدت محسوس کی۔ میں نے اہلیہ سے اپنی حالت کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی کہا کہ میں بھی نزلے اور بخار کی کیفیت محسوس کر رہی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے ہم دونوں اچھے خاصے بیمار بن گئے۔ نزلہ' کھانسی' بخار اور درد سر نے اس زور سے ہم پر حملہ کیا کہ ہم صاحب فراش ہو

گئے۔ اگرچہ اس بیماری کا یہ پہلو تو مبارک تھا کہ مدینہ منورہ کے بخار میں سے ہمیں بھی حصہ ملا لیکن اس خیال سے تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی کہ ہم جو اپنی کمزوریوں کے سبب سے اپنے ساتھیوں کے لیے پہلے بھی کچھ کم بوجھ نہ تھے اب اس بیماری کے سبب سے اور بھی بوجھ بن جائیں گے۔ اول اول تو حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنی دواؤں کا ہمارے اوپر تجربہ کیا' لیکن پھر ڈاکٹر احمد علی صاحب کو جن کا ذکر میں اوپر کہیں کر چکا ہوں' ہماری واپسی اور بیماری کا پتہ چل گیا۔ وہ سنتے ہی بھاگے ہوئے تشریف لائے۔ انہوں نے نہایت ہی اخلاص اور بڑی ہی بے تکلفی کے ساتھ شکوہ کیا کہ واپسی اور بیماری کی اطلاع مجھے کیوں نہیں دی گئی۔ انہوں نے فوراً انجکشن بھی لگائے اور کھانے اور پینے کے لیے مختلف دوائیں بھی تجویز کیں۔ اگرچہ سرکاری ملازم ہونے کے سبب سے زمانہ حج میں ان کو بڑی مصروفیت تھی لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باوجود روزانہ دو ایک بار ہمیں دیکھنے ضرور آتے۔ ان کی دواؤں اور ان کے انجکشنوں سے ہمیں بڑا فائدہ ہوا۔ بعض قیمتی دوائیں جو مکہ معظمہ میں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں' انہوں نے خاص اپنے اہتمام سے بلکہ اپنی جیب سے ہمارے لیے فراہم کیں۔

ڈاکٹر صاحب کے علاج سے بیماری کا اصلی زور تو ٹوٹ گیا لیکن ہم کمزور خاصے ہو گئے۔ اس کمزوری کے سبب سے ہم حرم کی حاضری سے محروم ہو گئے۔ سب سے زیادہ تشویش کا پہلو یہ تھا کہ ایام حج بالکل قریب آ گئے تھے اور ہماری کمزوری کا یہ حال تھا کہ مکان کی چوتھی منزل سے اترنا اور اس پر چڑھنا ہمارے لیے سخت دشوار تھا۔ منیٰ و عرفات کی حاضری کا مرحلہ ایک سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ ایک عازم حج کو اس مرحلے کی اتنی فکر ہوتی ہے کہ اس کا اندازہ وہ لوگ کسی طرح نہیں کر سکتے جو اس مرحلے سے گزرے نہ ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی اسی آگے کے مرحلے کی تھی۔ میں باربار یہی دعا کرتا تھا کہ اس مرحلے کے فرائض سے عہدہ برا ہونے کے لیے ہمیں قوت اور ہمت نصیب ہو اور اگر اس سرزمین پاک میں ہمارے لیے موت مقدر ہے تو خدا یہ موت عرفات کے میدان میں نصیب کرے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ زمانہ حج کے قریب آتے آتے ہم اچھے

ہو گئے۔ صرف کھانسی کی تکلیف باقی رہ گئی تھی جو کچھ عرصہ کے بعد ایک اور کرم فرما ڈاکٹر کے علاج سے 'جن کا ذکر آگے اپنے مقام پر آئے گا' جاتی رہی۔

زمانہ حج کے قریب بلد امین کا حال

اب ایام حج بالکل قریب تھے اس وجہ سے مکہ معظمہ کی حالت اب وہ نہیں باقی رہی تھی جو اس وقت تھی جب ہم مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اب شہر کا نقشہ بھی کچھ اور تھا اور حرم کا حال بھی بالکل مختلف تھا۔ اب جدھر نگاہ اٹھتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے اور لحظہ بہ لحظہ یہ سیلاب بڑھتا ہی جاتا تھا۔ حرم کے قرب وجوار میں مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جہاں آدمی کمر ٹکا سکتا ہو اور وہاں کوئی نہ کوئی صاحب اپنا بستر نہ جمائے ہوئے ہوں۔ باب ابراہیم کے سامنے تعمیر حرم کے لیے پتھر ڈھیر تھے' ان پر بستر لگانا تو درکنار بیٹھ کر رات گزارنے کی بھی کوئی شکل میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن کتنے اللہ کے بندے انھی پتھروں پر راتیں گزارتے تھے۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد نمازوں کے لیے جب میں حرم جانے لگا تو مجھے اندزہ ہوا کہ اب حرم میں جگہ حاصل کرنا کارے دارد۔ پہلے تو میں نے نئے حرم میں قسمت آزمائی کی' لیکن جب اطمینان کی کوئی جگہ مجھے وہاں بھی نہ مل سکی تو میں نے مسعیٰ کی بالائی منزل پر جانا شروع کر دیا۔ نمازوں کے اوقات میں حرم کے اردگرد کی سڑکیں اور گلیاں تک نمازیوں سے رک جاتی ہیں بلکہ حرم کے پاس کے مکانوں کے بے شمار آدمی تو اپنے مکانوں کے چھجوں ہی پر صفیں بنا لیتے ہیں اور امام حرم کی اقتدا میں نماز ادا کرتے ہیں۔

طواف کا تو میرے جیسے شخص کے لیے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ بس ایک آدھ طواف کا موقع اگر میسر آ جاتا تو ہم اسی کو غنیمت سمجھتے۔ نجد کے بدوی قبائل کے جو لوگ جمع ہو گئے تھے ان کے طواف کا طریقہ بھی ایسا تھا کہ میری تو ان کو دیکھ کر روح پرواز کرتی تھی۔ ان لوگوں کے طواف کا طریقہ یہ تھا کہ ٹولی کا ایک مرد جانباز آگے ہو جاتا اور ٹولی کے بقیہ تمام چھوٹے بڑے افراد عورتوں اور بچوں سمیت اس

کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لیتے' پھر وہ سب کو کہنیوں سے چیرتا پھاڑتا اور دھکے دیتا ہوا آگے بڑھتا اور اس کے سارے ساتھی ہر ایک سے لڑتے بھڑتے اس کے پیچھے پیچھے چلتے۔ ان لوگوں کے آ جانے کے بعد سے میری طواف کی ہمت بہت کمزور پڑ گئی۔ سخت سے سخت ازدحام کے اوقات میں بھی میں نے اس بات کی کوشش کی کہ نہ کسی کو دھکا دوں اور نہ کسی کا دھکا کھاؤں لیکن ان جانبازوں کے مقابل میں میری ساری احتیاطیں ناکام ہو کے رہ گئیں۔ ان کے دھکے سب کو کھانے پڑتے ہیں۔

آدمیوں کی اس کثرت نے شہر اور حرم کی صفائی کے سارے نظم کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ حجاز میں مہتروں کا وجود نہ ہونے کے باوجود شہروں میں صفائی کا انتظام کچھ ایسا خراب نہیں ہے۔ بالخصوص حرم کے خدام تو حرم میں صفائی کا خاص اہتمام رکھتے ہیں۔ لیکن حج کے زمانے میں حالات بالکل قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ شہر اور اس کی گلیاں تو الگ رہیں حرم اور اس کے گردوپیش کو بھی لوگ بالکل گندا کر کے رکھ دیتے ہیں بالخصوص یمن اور حبشہ کے لوگ اس گندگی کے پھیلانے میں بہت بے پروا ہیں۔ باب ابراہیم کے پاس کنکریوں کا ایک پلاٹ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اس پلاٹ میں بچے پاخانہ پھر دیتے تھے اور حبش اور یمن کی خواتین بس یہ کرتی تھیں کہ اس گندگی کو کنکریوں سے ڈھانک دیتی تھیں۔ ایک ستم یہ ہے کہ حاجی حضرات حرم کے کبوتروں کے لیے گندم خرید خرید کر کنکریوں والے پلاٹوں میں بکھیرتے رہتے ہیں۔ حج کے زمانے میں اس کی مقدار اتنی ہو جاتی ہے کہ بلا مبالغہ کنکریوں کے اوپر گندم کی ایک تہہ بچھ جاتی ہے۔ پھر جب اس پر لوگ بے احتیاطی سے پانی گراتے ہیں اور وہ گندم سڑتی ہے تو اس سے تعفن پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بہت آسان علاج یہ تھا کہ حرم سے باہر ایک خاص پلاٹ کبوتروں کو دانے ڈالنے کے لیے بنوا دیا جاتا اور حرم کے اندر ان کے لیے دانے ڈالنے کی ممانعت کر دی جاتی۔

جگہ جگہ حرم میں میں نے لوگوں کو بے احتیاطی کے ساتھ تھوکتے اور ناک صاف کرتے بھی دیکھا۔ اس معاملے میں لوگ مجبور بھی ہوتے ہیں۔ آخر ہجوم کے اوقات میں

کسی کو تھوکنے یا ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ کیا کرے۔ اس ضرورت کے لیے اگر جگہ جگہ کھمبوں اور ستونوں کے ساتھ ٹین یا لکڑی کے ڈبے بندھوا دیے جائیں اور ان کو وقتاً فوقتاً چونے یا ریت سے بھروایا جاتا رہے اور ان کی صفائی ہوتی رہے تو اس سے بہت بڑی حد تک صورت حال کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

اس ظاہری گندگی سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ نمایاں ہوئی کہ بہت سے ممالک کے حجاج شرم و حیا کے حدود ملحوظ رکھنے کے معاملہ میں بالکل بے شعور نظر آئے۔ باب ابراہیم کے پاس توسیع حرم کی اسکیم کے تحت جو نیو کھودی گئی تھی حبشہ اور یمن کے حجاج نے اس کو رفع حاجت کا مرکز بنا رکھا تھا۔ اور یہ کام وہ جس بے تکلفی کے ساتھ انجام دیتے تھے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حیا جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم سے یہ حضرات بالکل ناآشنا ہیں۔ زم زم کے پاس اب حکومت نے پانی لینے کی آسانی بہم پہنچانے کے لیے ٹونٹیاں لگوا دی ہیں لیکن بعض لوگوں کو میں نے ان سے جو فائدہ اٹھاتے دیکھا وہ یہ ہے کہ ان کے نیچے وہ ننگے ہو کر نہاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سفر بہت سی باتوں کے لیے انسان کو مجبور کر دیتا ہے لیکن ان خرابیوں کی اصلی وجہ مجبوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک کی یہ مشترک خرابی ہے کہ عوام کے ذمہ داروں نے عوام کو مہذب اور شائستہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

خرید و فروخت کی گرم بازاری

حج کے زمانے میں مکہ معظمہ میں خرید و فروخت کی جو گرم بازاری ہوتی ہے اس کا اندازہ ہم آپ کسی طرح نہیں کر سکتے۔ یہ بات بلامبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اس زمانے میں اہل مکہ حاجیوں کے ہاتھوں اس مقدس سرزمین کی مٹی اور اس کا پانی تک بیچ لیتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں یہاں بہت مہنگی ہیں لیکن جھینگے سے لے کر اونٹ تک جو چیز بھی بازار میں پہنچ جاتی ہے بے تکلف بکتی ہے۔ کچے پکے پھل لوگ کھیتوں اور باغوں سے توڑ کر بازاروں میں لا ڈالتے ہیں اور ہر چیز فروخت ہو جاتی ہے۔

سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ تمدنی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ سعودی حکومت میں اشیائے درآمد پر کسٹم نہیں ہے اس وجہ سے ولایت کے بازاروں کی چیزیں یہاں بہت سستی بکتی ہیں۔ ریشمی کپڑے، قالین، غالیچے، جانمازیں، رومال، گھڑیاں، تھرماس، چولھے اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہمارے بازاروں کے لحاظ سے اتنی ارزاں بکتی ہیں کہ جو آدمی بازار کی طرف نکل جائے اس کا ایمان آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ حاجی صاحبان دل کھول کر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے رویے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سفر کرتے ہی اس خرید و فروخت کے لیے ہیں۔ ہماری حکومت نے اگرچہ زرمبادلہ پر بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ طلب صادق رکھنے والے زرمبادلہ کی بھی ہزار راہیں کھول لیتے ہیں۔ یہ چیزیں جس دھوم دھام سے بکتی ہیں وہ منظر بھی دیدنی ہوتا ہے۔ مجھے بازار کی طرف جانے کے مواقع تو کم ہی پیش آئے لیکن بعض گلیوں اور سڑکوں سے ایک آدھ مرتبہ گزرنا ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگ تھرماس اور گھڑیاں اس طرح خرید رہے ہیں جس طرح مچھلی کے بازار میں مچھلی کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ دکان دار یہ سوچتے ہیں کہ اگر سیزن نکل گیا تو پھر سال بھر مال کا پوچھنے والا کوئی نہیں ملے گا اور خریداروں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ آج چوک گئے تو معلوم نہیں پھر یہ چیز ہاتھ آئے یا نہ آئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دکان داروں اور گاہکوں دونوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ اس سے بہت کچھ مختلف ہوتا ہے جس کی مثالیں ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے دکان دار گاہکوں پر اعتماد ہمارے دکان داروں کی نسبت سے زیادہ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ چیزیں بار بار دکانوں سے لاتے ہیں اور ناپسند ہونے کی صورت میں ان کو بدلوا لیتے ہیں۔

میرے لیے اس خرید و فروخت کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ یہ تمدنی چیزیں بڑی کثرت کے ساتھ ان لوگوں نے بھی خریدیں جن میں سے اکثر کو اس طرح کی چیزوں کے استعمال کا کوئی تجربہ پہلے سے نہ تھا۔ مجھے اس کا اندازہ اس طرح ہوا کہ واپسی میں جہاز میں ایک صاحب کبھی کبھی اپنی گھڑی میں چابی دینے اور اس کے وقت کو ٹھیک کر دینے کی

فرمائش مجھ سے کیا کرتے۔ وہ گھڑی کلائی میں باندھتے بھی الٹی تھے لیکن میں نے ان کو ٹوکنے کی ہمت نہیں کی۔ میں نے خیال کیا کہ فیشن کی تلون پسندیوں کا کیا اعتبار۔ ممکن ہے اب یہی فیشن ہو۔ آخر میں فیشن کا کوئی ماہر تو نہیں ہوں۔ ان کی گھڑی خاصی قیمتی معلوم ہوئی اس وجہ سے یہ تعجب ضرور ہوتا کہ آخر اس بے خبری کے باوجود انھوں نے اتنے روپے اس گھڑی پر کیوں خرچ کرڈالے۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کسی دوست یا عزیز کی فرمائش ہو یا پاکستان پہنچ کر بیچ دینے کا ارادہ ہو۔

حجاج کے شب و روز

عام حجاج کے شب وروز ازدحام کے زمانے میں خاصے سخت گزرتے ہیں۔ مکانوں کی قلت اور کرایوں کی غیر معمولی زیادتی کے سبب سے معقول قسم کی رہائش کا انتظام بہت تھوڑے لوگ کرپاتے ہیں۔ اندرون ملک کے جو زائرین آتے ہیں وہ تو بالعموم سڑکوں کے کناروں ہی پر اپنے خیمے لگالیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے ٹرک ساتھ لاتے ہیں' وہ اپنے قافلے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ ان ٹرکوں کے سائے ہی میں دن گزارتے ہیں۔ جو لوگ کوئی مکان کرائے پر لیتے ہیں عموماً اس کا فائدہ انھیں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتا کہ ایک مکان کے ساتھ ان کو نسبت حاصل ہو جاتی ہے' مکان کی کوئی راحت ان کو مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فائدہ اس مکان سے وہ حاصل کر پاتے ہیں تو بس یہ کہ اس میں کسی نہ کسی طرح اپنے سامان انبار کردیتے ہیں۔ کرائے کی کفایت کے خیال سے ایک ایک کمرے میں اتنے آدمی شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ کمرہ ایک انار صد بیمار کا مصداق بن کے رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالعموم یہ لوگ مکان رکھتے ہوئے بھی لامکاں ہی رہتے ہیں۔ رفع حاجت کہیں کرلیتے ہیں' نہانے پر مجبور ہوئے تو نگرانوں کی آنکھیں بچاکر زم زم کی ٹونٹیوں کے نیچے کھڑے ہوگئے' نیند کا غلبہ ہوا تو حرم کی کنکریوں پر پڑے رہے۔ ہمارے مکان کے پیچھے ایک مکان میں مصری اور شامی حجاج ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلامبالغہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں کوئی پندرہ بیس افراد رہے ہوں

گے۔ جب کبھی اتفاق سے یہ سب شرکا جمع ہو جاتے تو ان کے بیٹھنے کے لیے بھی جگہ اتنی تنگ ہوتی کہ سب دوزانو ہو کر ہی بیٹھتے۔ لیکن یہ لوگ تھے بڑے بھلے مانس۔ میں نے ان کو لڑتے جھگڑتے بہت کم دیکھا۔ اس طرح کی حالت کے اندر سب سے زیادہ تکلیف خواتین کو ہوتی ہے۔ مصر اور شام وغیرہ کی خواتین تو کسی نہ کسی طرح گزار لے جاتی ہیں' ان کی روایات ہماری روایات سے مختلف ہیں' لیکن ہمارے ملک کی خواتین کے مزاجوں پر اس صورت حال کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔

مکہ کی گرمی میں آدمی دو ایک مرتبہ' روزانہ نہ نہائے تو خلجان ہونے لگتا ہے لیکن زمانہ حج کے قریب اور ایام حج میں تو پانی کا بھاؤ اس قدر چڑھا دیتے ہیں کہ عام لوگ نہانے کی ہمت مشکل ہی سے کرسکتے ہیں۔ کھانے کی چیزیں سارے حجاز میں عام حالات میں بھی بہت گراں بکتی ہیں لیکن ایام حج کے قریب تو بس کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ کوئی شخص تھوڑا سا خشکہ اور تھوڑی سی دال بھی خریدے تو اس کی قیمت بھی ڈیڑھ دو ریال بن جائے گی اور لطف یہ کہ چاول اور دال دونوں میں اچھا خاصا اوسط کنکریوں کا بھی ہوگا۔ ہم جس زمانے میں تھے وہ زمانہ پھلوں کا نہ تھا اس وجہ سے پھل خراب بھی ملتے تھے اور خاصے گراں بھی۔ البتہ کیلے نسبتاً سستے اور نہایت اچھے ملتے تھے۔ ہم لاہور سے کیلوں کے لیے ترسے ہوئے گئے تھے اس وجہ سے کیلے خوب کھاتے تھے۔

ہجوم سے اُنس

میرے اندر ابتدا سے یہ بڑی کمزوری رہی ہے کہ جہاں ذرا کوئی ہجوم نظر آیا اور مجھ پر گھبراہٹ اور الجھن کی حالت طاری ہوئی۔ لیکن حجاج کے اس سمندر میں رہتے رہتے میں اس سمندر کی ایک مخلوق بن گیا۔ میں مسعیٰ سے لے کر اپنی قیام گاہ تک شب وروز میں کتنی مرتبہ آتا جاتا اور محسوس ایسا ہوتا کہ انسانوں کی ایک موج کے کندھے پر سوار ہو کر جاتا ہوں اور ایک موج ہی کے کندھوں پر سوار ہو کر واپس لوٹتا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس ہجوم میں افراتفری اور دھکم پیل کی کیفیت زیادہ نہیں ہوتی۔ معلوم

ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے شخصی ارادے سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو بس ہجوم کے حوالے کر دیتا ہے۔ دن کے وقتوں میں اگر کوئی ڈر ہوتا ہے تو یہ ہوتا ہے کہ کسی کی چھتری کی تیلیاں آپ کی آنکھوں میں نہ گھس جائیں۔ اس خطرے کی مدافعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ بھی اپنے پاس چھتری رکھیے۔ میں بھی اپنے پاس چھتری رکھتا تھا اور دھوپ کے بچاؤ سے زیادہ میرے پیش نظر یہی چیز ہوتی کہ میری آنکھیں دوسروں کی بے شمار چھتریوں سے محفوظ رہیں۔ اس زمانے میں اگر کوئی شخص مطاف میں اترے تو اس کے لیے بھی بہترین حکمت عملی یہی ہے کہ اپنے آپ کو بس موجوں کے حوالے کر دے۔ صرف اتنی بات کا خیال رہے کہ ان نجدی جاں بازوں کی زد میں کہیں نہ آ جائے جن کا ذکر میں کہیں اوپر کر چکا ہوں۔

ہجوم کے ساتھ سازگاری کی حقیقت سمجھانے کے لیے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ میں نے وہاں حرم آنے جانے کے لیے ربڑ کی چپلیں خرید لی تھیں۔ یہ چپلیں نہایت آرام دہ تھیں۔ میں ایک روز نماز پڑھ کے باب الجیاد سے نکلا اور گھر کی طرف چلا تو ہجوم میں کسی کے پاؤں میں پھنس کر میرے ایک پاؤں کی چپل وہیں رہ گئی۔ چپل اگرچہ نئی تھی، اس کے یوں ضائع ہو جانے کا مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا، لیکن میں نے اس کی طرف مڑ کے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔ اگر کیا تو یہ کیا کہ دوسرے پاؤں کی چپل بھی وہیں چھوڑ دی۔ اگر خدانخواستہ میں اس چکر میں پھنس جاتا کہ گم شدہ چپل کو حاصل کروں تو یہ چیز مجھے مہنگی پڑ جاتی۔ البتہ یہ میرا محض ایک تکلف تھا کہ میں نے دوسری چپل بھی وہیں چھوڑ دی۔ اگر میں اسی حالت میں گھر لوٹتا کہ میرے ایک پاؤں میں چپل ہوتی اور دوسرا پاؤں ننگا ہوتا جب بھی کوئی شخص یہاں میری اس حالت پر ہنسنے والا نہیں تھا۔ یہاں آدمی ہر وقت اتنی قسم کی شکلیں، اتنی قسم کی نمازیں اور اتنے گوناگوں اور بوقلموں فیشن دیکھتا رہتا ہے کہ اس کے لیے کوئی فیشن بھی عجیب نہیں رہ جاتا۔ یہ عین ممکن تھا کہ کوئی شخص میرے ایک پاؤں میں چپل دیکھ کر اس پر ہنسنے کے بجائے اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا کہ شاید میں کسی ایسے ملک سے تعلق رکھتا ہوں جہاں کے لوگ ایک ہی

پاؤں میں جوتی پہنتے ہیں۔

عرفات کی فکر

عرفات کی فکر بھی ایک بڑی ہی جاں گسل فکر ہے۔ میں دوسروں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میرے لیے تو اس فکر نے ایک بیماری کی سی شکل اختیار کر لی۔ رات کو سوتا تو آخری چیز جو میرے ذہن پر سے اُترتی وہ یہی فکر ہوتی اور صبح کو اٹھتا تو پہلی چیز جو میرے ذہن کے اندر داخل ہوتی وہ یہی فکر ہوتی۔ بس ہر وقت یہی خیال کہ پروردگار نے یہاں تک پہنچایا ہے تو خیریت اور سلامتی کے ساتھ عرفات میں بھی پہنچا دے۔ کئی دن پہلے سے میں نے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو تاکید کرنی شروع کی کہ معلم صاحب سے عرفات جانے کے انتظامات کی تفصیلات معلوم کریں وہ جو تفصیلات سناتے اس سے یہ معلوم ہوتا کہ معلم صاحب سارے انتظامات سے فارغ ہیں۔ اب تک معلم صاحب کا جو تجربہ ہوا تھا وہ بھی ہر پہلو سے اطمینان بخش تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ ہر حاجی کو عرفات پہنچانا صرف معلم حضرات کی ذمہ داری نہیں بلکہ خود حکومت کی بھی ذمہ داری ہے اور سعودی حکومت اپنی اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں نہایت فرض شناس اور مستعد ہے۔ لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے رہتے اور وہ مجھے ستاتے رہتے۔

آنے والوں کا انتظار

اس دوران میں ہمیں ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے بعض دوستوں کا انتظار بھی رہا۔ ہندوستان سے جو آنے والے تھے وہ آخری جہاز سے آ گئے۔ ان میں میرے لیے قابل ذکر میرے ایک عزیز مولوی قمرالزماں صاحب اصلاحی تھے۔ یہ میرے عزیز بھی ہیں اور میرے شاگرد بھی۔ ان کو بچپنے سے مجھ سے اُنس رہا ہے اور میرے دل کو بھی ان سے خاصا تعلق ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اور ان کو بڑی اچھی جگہ پر یکجا کر دیا۔ یہ آئے تو میرے لیے بمبئی سے ایک دوست کا بھیجا ہوا آموں کا تحفہ بھی لائے۔

اگرچہ بمبئی سے مکہ معظمہ تک پہنچتے پہنچتے ان آموں کی مقدار تو بہت تھوڑی سی رہ گئی تھی لیکن بھیجنے والے اور لانے والے کے خلوص کی مقدار بہت زیادہ تھی اور کسی تحفے کی اصلی روح یہ خلوص ہی ہے۔

پاکستان سے پہنچنے والے آخری جہاز کو عجیب افتاد پیش آئی۔ حجاج کے مکہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے لیکن یہ جہاز جدہ نہیں پہنچا۔ یہ جہاز اپنی پہلی ٹرپ میں بھی راستہ میں گڑبڑ ہو چکا تھا اس وجہ سے ہر شخص کو نہایت بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ پاکستانی سفارت خانے یا اپنے معلم کے وکیل مقیم جدہ سے رابطہ قائم کر کے معلوم کریں کہ جہاز اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ حکیم صاحب نے معلومات حاصل کر کے شام کو یہ اطلاع دی کہ جہاز کا انجن خراب ہو چکا ہے اور وہ جدہ سے کچھ دور سمندر میں کھڑا ہے۔ اس خبر سے دل کو جو صدمہ پہنچا میں اس کا اندازہ نہیں کرا سکتا۔ فرط غم سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب منیٰ اور عرفات کے لیے روانگی میں صرف دو راتیں حائل رہ گئی تھیں۔ مجھے جب یہ خیال آتا کہ ان ہزاروں عازمین حج پر اس وقت کیا گزر رہی ہو گی جو اس جہاز پر ہیں تو میرا دل صدمے سے پھٹنے لگتا۔ میں نے نہایت پریشانی کے عالم میں حرم میں جا کر ان مسافروں کے لیے دعائیں کیں۔ بالآخر جب منیٰ کے لیے روانگی میں صرف بارہ گھنٹے باقی رہ گئے تو یہ مژدۂ جاں فزا موصول ہوا کہ جہاز ساحل جدہ پر لنگر انداز ہو چکا ہے اور حکومت پوری مستعدی کے ساتھ حجاج کو مکہ معظمہ پہنچانے کا انتظام کر رہی ہے۔ میں یہ خبر سن کر سجدے میں گر پڑا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عین اس وقت جب کہ ہم منیٰ کے لیے روانہ ہو رہے تھے یہ عازمین حج مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

تین دن منیٰ میں

منیٰ پہنچ کر ہمیں سب سے پہلے رمی جمرہ کرنا تھا' اس کے بعد قربانی کرنی تھی' پھر حجامت بنوا کر ہم احرام کی بڑی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ اچھی طرح تھا کہ مزدلفہ سے واپس آتے ہی یہ ساری خلقت رمی جمرہ کے لیے ٹوٹ پڑے گی اور اس بے پناہ اژدحام میں میرے جیسے شخص کے لیے بالخصوص اہلیہ کے ساتھ مقام رمی تک پہنچ سکنا ناممکن ہو گا۔ چنانچہ میں نے خیال کیا کہ میں اولیت و افضلیت کا ثواب حاصل کرنے کے بجائے رخصت سے فائدہ اٹھاؤں اور کسی ایسے وقت میں رمی جمرہ کے لیے جاؤں جب ذرا آسانی کی توقع ہو۔ میں اپنی مجبوریوں کے پیش نظر اپنے ذہن میں یہی خیال لیے ہوئے تھا لیکن میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ افضلیت و عزیمت کا ثواب حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کی اس سرگرمی نے کچھ حرارت میرے اندر بھی پیدا کر دی اور ہم میاں بیوی بھی انہی کے ساتھ اللہ کا نام لے کر اس جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

ہم کچھ ہی دور آگے بڑھے ہوں گے کہ مجھے یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا کہ کم از کم میرے اور میری اہلیہ کے لیے تو مقام رمی تک پہنچنا ناممکن ہے۔ لیکن ایک نیک کام کا ارادہ کر لینے کے بعد اس سے پلٹنا ایک قسم کی کمزوری معلوم ہوا' اس وجہ سے پیچھے مڑنے کے بجائے جتنے قدم آگے بڑھنا ممکن ہوا میں آگے ہی بڑھتا گیا۔ اگرچہ صورت حال سے طبیعت پر ایک سخت دہشت سی طاری تھی لیکن یہ امید ایک سہارا بنی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے اٹھے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گا۔ اس موقع پر مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہجرت والا واقعہ باربار یاد آتا رہا۔ بالآخر میں ایک ایسے نقطے پر

پہنچ گیا جہاں سے نہ میرے لیے آگے بڑھنا ممکن رہ گیا اور نہ پیچھے ہٹنا۔ میرے رفقا اگرچہ اس اعتبار سے آزاد تھے کہ ان میں سے ہر ایک پر بس اپنے ہی نفس کی ذمہ داری تھی، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی خاتون نہیں تھی، لیکن صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری تھی۔ وہ دل سے چاہتے رہے ہوں گے کہ میری کچھ مدد کریں لیکن چاہنے کے باوجود وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میرا دل بالکل خدا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رمی کے میدان اور سڑک کے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ اس دیوار نے مجھ کو اور میری اہلیہ کو بڑا سہارا دیا۔ ہم اس دیوار کا سہارا لے کر حیران و ششدر کھڑے ہو گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ ہجوم کا کوئی ریلا ہمیں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ لے جا پھینکے۔ ہم دونوں اس پریشانی کے عالم میں کوئی مفر تلاش ہی کر رہے تھے کہ ایک زبردست موج آئی اور اس نے ہمیں اٹھا کر اس جمرہ کے قریب پھینک دیا جس پر ہمیں کنکریاں مارنی تھیں۔ پاس ہی ڈیوٹی کے سپاہی کی راوٹی تھی جس کو ہجوم کی ریلے نے اکھاڑ کے پھینک دیا تھا۔ پولیس والا سہما ہوا دیوار سے لگا کھڑا تھا اور دو تین مصری عورتیں اس کی پناہ میں تھیں۔ ہمیں بھی اس سے کچھ سہارا ملا۔ ہم جوں توں کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے اور پھر کسی نہ کسی طرح اس ہجوم سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچ سکے جہاں پہنچ کر ہمیں یہ توقع ہوئی کہ اب ہم شاید زندہ و سلامت گھر تک پہنچ جائیں۔

مجھے اس طرح کی صورت حال سے زندگی میں کبھی سابقہ پیش نہیں آیا تھا اس وجہ سے میرے اعصاب پر اس کا بہت سخت اثر پڑا۔ قدرتی طور پر میری اہلیہ مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پہلے دن کی رمی افضل وقت میں صرف مضبوط لوگ ہی کر سکتے ہیں جن لوگوں کے ساتھ عورتیں اور بچے ہوں انھیں اپنے آپ کو اس سخت امتحان میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

قربانی کے لیے

رمی سے فارغ ہو کر اب ہمیں قربانی کے لیے جانا تھا۔ مجھے یہ قربانی اپنے ہاتھ سے انجام دینے کا بڑا شوق تھا۔ اس وجہ سے اس شدید تکان اور اضمحلال کے باوجود، جو رمی کے مذکورہ جہاد نے مجھ پر طاری کر دی تھی، میں قربان گاہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر سے باہر نکل کر کچھ ہی دور چلا ہوں گا کہ ایک خاتون نے اپنے کسی عزیز یا عزیزہ کے گم ہونے کی اطلاع دی اور اس معاملے میں مدد اور رہنمائی کی طلب گار ہوئیں۔ حکیم صاحب پیچھے تھے، وہ آئے تو اس واقعہ کا ذکر میں نے ان سے کیا۔ وہ فوراً گم شدہ کی تلاش کی مہم پر روانہ ہو گئے اور میں ان کی واپسی کے انتظار میں ایک ٹرک کے سائے میں بیٹھ گیا۔ منیٰ کی دھوپ میں مجھے یہ ٹرک کا سائے بھی بسا غنیمت معلوم ہوا۔ حکیم صاحب نے گم شدہ کی تلاش میں بڑی دیر لگا دی اور مجھے ٹرک کے سایہ میں بیٹھے بیٹھے یہ اندازہ ہوا کہ رمی جمرہ کی جدوجہد میں میں نے جو دھکے کھائے ہیں ان کے اثر سے اب بیماری کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ دھوپ نہایت سخت تھی اور قربان گاہ وہاں سے بہت دور۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو مزید کسی مشقت میں ڈالا تو یہ چیز میری قوت برداشت سے باہر ہو جائے گی اور عجب نہیں کہ میں بیمار پڑ جاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ قربانی کے معاملے میں میری نیابت کریں اور مجھے قیام گاہ پر واپس جانے کی اجازت دیں۔ ان کو میری حالت پر ترس آ گیا اور تھوڑی سی ردوقدح کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گئے۔

وہ گھر سے آٹھ نو بجے کے نکلے ہوئے کہیں سہ پہر میں اس فرض سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ واپس آتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا ہوا تم نہیں گئے، ورنہ واقعی بیمار پڑ جاتے۔ پھر ان ساری زحمتوں اور مشقتوں کی انھوں نے تفصیل سنائی جن سے انھیں گزرنا پڑا۔ میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ تفصیلات تھیں جو انھوں نے قربان گاہ اور قربان کیے ہوئے جانوروں سے متعلق سنائیں۔ قربان گاہ کے یہ مشاہدات ان

لوگوں کے دلوں میں بہت سے شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں جو قربانی کی روحانی قدروقیمت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان شبہات کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ان انتظامی خرابیوں کو ہے جو اب تک اس خاص شعبہ میں نہایت بدنما شکل میں نمایاں ہیں۔ امت کی کثرت کے ساتھ ساتھ ضروری تھا کہ انتظامات میں وسعت اور ترقی ہوتی اور اس سلسلے میں ممکن حد تک وقت کی سائنٹفک ترقیوں سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے سعودی حکومت کے اپنے ذرائع و وسائل بھی خدا کے فضل سے اب کم نہیں ہیں۔ اور اگر وہ کچھ کمی محسوس کرے تو دوسری مسلمان حکومتوں کو تعاون کی دعوت دے سکتی ہے۔ قربان گاہیں اتنی تعداد میں ہوں کہ منیٰ کے ہر حصے میں مقیم حاجیوں کے لیے ان تک پہنچنا آسان ہو' صفائی کے اس سے بہتر انتظامات ہونے ضروری ہیں' کھالوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک بڑے پیمانے کی ٹینری قائم کی جا سکتی ہے اور سائنس کی ترقی کے اس دور میں تو غربا کے لیے گوشت محفوظ کرنے کی بھی بعض شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ میرے نزدیک ان چیزوں کا کاروباری نقطہ نظر سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ قربانی کی عظیم روحانی قدروقیمت کو پیش نظر رکھ کر محض دینی و اسلامی نقطہ نظر سے یہ کام ہونے چاہئیں اگرچہ کاروباری نقطہ نظر سے ان کاموں کا کوئی خاص فائدہ نہ بھی ہو۔

حجامت

قربانی سے فارغ ہونے کے بعد ہم حجامت بنوانے کے لیے اٹھے۔ مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ کے پہلے دن حجامت کا کاروبار اس بڑے پیمانے پر ہوتا ہے کہ بلامبالغہ جو شخص ہاتھ میں صحیح طور پر استرہ بھی نہ پکڑ سکتا ہو وہ بھی اگر کسبت لے کر سڑک کے کنارے کہیں بیٹھ جائے تو شام تک سینکڑوں ریال لے کر اٹھے۔ میں سید عقیل صاحب کے چوبارے میں بیٹھا ہوا حجامت کی بے شمار قسمیں دیکھتا اور ان کو گنتا رہا۔ اس دن سر کا منڈانا درویشی اور عبدیت کا ایک نشان ہے اس وجہ سے تزئین و آرائش کا تو اس میں

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن یہ چیز میرے دل پر بڑی شاق گزرتی تھی کہ بہتوں کو میں نے دیکھا کہ حجام نے اپنی صوابدید سے جہاں جہاں سے چاہا ہے ان کے سر کے بال مونڈ دیے ہیں اور جہاں سے چاہا ہے چھوڑ دیے ہیں۔ مجھے حجامت بنانے والوں کی اس خودمختاری سے اختلاف تھا اس وجہ سے میں تردد میں پڑ گیا کہ مجھے اس صورت حال کے پیش نظر اب کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اپنے سابق فیصلے کے مطابق حلق کرانا چاہیے یا تقصیر ہی پر قناعت کرنی چاہیے۔ حکیم صاحب نے میرے اس تردد کو دیکھا تو بولے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں سر کٹانے کا دم داعیہ لے کر اٹھے ہوں' انھیں سر منڈانے کے معاملے میں اتنا متردد نہیں ہونا چاہیے۔ چلو' میں تمہارے حسب منشا انتظام کر دوں گا۔ ان کی اس حوصلہ افزائی سے مجھے بڑا اطمینان ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ ہم احرام کی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی فارغ ہو گئے۔

نہادھو کر اور کپڑے بدل کر جب میں عصر کی نماز کے لیے مسجد گیا ہوں تو میرا دل غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ یہ خوشی مجھے مسجد میں ہر چہرے پر محسوس ہوتی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے یہ صرف ایک اہم فریضے کی ادائیگی کی خوشی تھی۔ بس دل اس خیال سے باغ باغ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ایک بہت بڑی آرزو پوری کرا دی۔

دعوتیں

منیٰ کے دوران قیام میں مختلف سرکاری دعوتیں بھی ہوتی ہیں۔ بعض سفارت خانوں کی طرف سے مجھے بھی دعوت نامے موصول ہوئے مگر مجھے سید عقیل صاحب کے چوبارے میں بیٹھے بیٹھے منیٰ کے تمام مناظر کی سیر اتنی دلکش معلوم ہوتی تھی کہ اس کو قربان کر کے کہیں آنا جانا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا۔ چنانچہ میں کسی دعوت میں بھی نہ جا سکا۔ حکیم صاحب غالباً بعض دعوتوں میں شریک ہوئے۔

سعید رمضان صاحب سے ملاقات

منیٰ کے قیام کے پہلے ہی دن یا دوسرے دن‘ میں چوبارے میں بیٹھا ہوا ملنے جلنے والوں سے خوش گپ کر رہا تھا کہ ایک مصری یا شامی نوجوان آئے اور انھوں نے علیک سلیک کے بعد پوچھا کہ ”آپ سعید رمضان کو جانتے ہیں؟“ میں نے جواب دیا کہ ”جی ہاں‘ ان کو جانتا بھی ہوں اور ان سے محبت بھی کرتا ہوں“ وہ بولے کہ انھوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ ”اگر آپ فارغ ہوں تو وہ یہاں آ جائیں ورنہ وہ فندق تیسیر میں مقیم ہیں آپ جب فارغ ہوں وہاں آ جائیے۔“ میں نے کہا کہ ”آپ ان سے میرا بہت بہت سلام عرض کیجیے اور کہیے کہ وہ یہاں آنے کی زحمت نہ اٹھائیں‘ میں ان سے شام تک انشاء اللہ خود ان کے ہوٹل میں ملوں گا۔“

شام کو میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو ساتھ لے کر سعید رمضان صاحب سے ملنے کے لیے فندق تیسیر پہنچا۔ یہ ہوٹل بالکل جمرہ وسطی کے پاس ہے۔ میں ہوٹل میں داخل ہوا تو میں نے ہوٹل کے منیجر صاحب سے پوچھا کہ فلاں نمبر کا کمرہ ہوٹل کے اوپر کی منزل میں ہے یا نیچے کی منزل میں؟ وہ میرا یہ سوال سن کر کچھ مسکرائے اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ان کے مسکرانے اور میرے سوال کا جواب نہ دینے پر کچھ حیرانی سی ہوئی۔ اتنے میں ایک صاحب ہوٹل کے اوپر والی منزل کے زینے سے‘ جو میرے پیچھے تھا‘ اترے اور ”استاذامین“ ”استاذامین“ کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ سعید رمضان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے مجھے سعید رمضان صاحب سے کبھی ملاقات کی سعادت نہیں حاصل ہوئی تھی اس وجہ سے ان کی اس محبت اور اس بے تکلفی کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

منیجر صاحب نے وہیں اپنے کمرے ہی میں فوراً کرسیاں ڈلوا دیں اور ہم بیٹھ گئے۔ سعید رمضان صاحب باربار میرے شانوں اور میری رانوں پر تھپکیاں دیتے اور خیریت پوچھتے۔ اگرچہ اس طرح محبت کا اظہار اہلِ عرب کے آداب میں داخل ہے لیکن سعید

رمضان صاحب کے طرزِ عمل میں صرف آداب کا رکھ رکھاؤ ہی نہیں تھا بلکہ جذبات محبت کی غیر معمولی فراوانی بھی تھی جو ان کی ایک ایک ادا سے نمایاں ہو رہی تھی۔

بیٹھتے ہی سعید رمضان صاحب نے پوچھا کہ کوئی ٹھنڈی چیز پیو گے یا گرم۔ ہم نے کہا یکے بعد دیگرے دونوں۔ وہ ہماری اس بے تکلفی سے بہت خوش ہوئے اور ہماری خواہش پر انھوں نے پہلے ٹھنڈا پانی منگوایا اور پھر عمدہ قسم کی چائے۔ انھوں نے بغیر کسی تمہید کے مجھ سے کہا کہ جماعت اسلامی کے ساتھ تمہارے جو اختلافات ہیں ان کی خاص خاص بنیادی باتیں مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یہ داستان بڑی طویل ہے‘ اس کے سننے کے لیے نہ آپ کے پاس وقت ہے اور نہ میں اس کے بیان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے کہا میں صرف چند اصولی باتیں جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہ باتیں عمر بہا امیری صاحب سے (موصوف ایک زمانہ میں پاکستان میں شام کے سفیر رہ چکے ہیں) معلوم کر سکتے تھے‘ وہ ساری تفصیل سے واقف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ افسوس ہے کہ لاہور میں منعقد ہونے والی کلوکیم سے ان کی واپسی کے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر وہ اس اختلاف کے اسلامی تحریکات پر اثرات کو بیان کرنے لگے اور کہا کہ جس طرح بھی ہو ان اختلافات کو دور ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس خواہش میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہوں‘ اسی طرح کی خواہش کا اظہار مجھ سے امیری صاحب نے بھی کیا تھا اور انھی کے اصرار پر میں نے ان کا حکم بھی مان لیا تھا۔ اب آپ ان سے معلوم کیجیے کہ وہ کوئی فیصلہ کیوں نہ کر سکے؟ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں اس معاملے میں دخل دوں تو کیسا رہے گا؟ میں نے کہا کہ آپ اس معاملے میں دخل دینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخص ہو سکتے تھے لیکن اب میری سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ ہے کہ اس چیز کا وقت گزر چکا ہے۔ اب اگر آپ نے دخل دیا تو اِس کا نتیجہ اُس سے شاید کچھ بہتر نہ نکل سکے جو امیری صاحب کی کوششوں کا نکل چکا ہے۔ میرے اس جواب کے بعد انھوں نے باربار بڑے گہرے تاثر کے ساتھ یہ فرمایا کہ بات بڑے غم کی ہے۔ یہ بہت بڑا حادثہ ہے۔

ہماری اس گفتگو کے دوران ہی میں یکے بعد دیگرے ان کے بہت سے ملنے والے آتے اور بیٹھتے رہے۔ وہ دو دو باتیں ان سے بھی کر لیتے اور پھر میرے شانے تھپکتے ہوئے دو دو باتیں مجھ سے بھی کر لیتے۔ میں نے اتنی ہی دیر میں یہ محسوس کیا کہ مختلف امصار و دیار کے لوگوں میں ان کو بڑی محبوبیت و مرجعیت حاصل ہے لیکن اس محبوبیت و مرجعیت کے باوجود ان میں قائدانہ ترفع اور زعیمانہ تمکنت کی قسم کی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ ہر ایک سے بڑی خاکساری' بڑی تواضع اور بڑی محبت سے ملتے ہیں۔ ان کے چہرے سے سادگی اور ذہانت دونوں کے آثار بیک وقت ہویدا ہیں۔ پیشانی اخلاص کی گواہی دیتی ہے اور آنکھیں دل کی صفائی کی۔ ان کی کوئی حرکت بھی مجھے مصنوعی نہیں معلوم ہوئی۔

جب ان کو دوسرے ملنے والوں نے گھیر لیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں کل مکہ واپس جا رہا ہوں۔ وہاں فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ اب وہاں ہم ملیں گے اور انشاء اللہ تفصیل سے باتیں کریں گے۔ اس کے بعد ہم سعید رمضان صاحب کے خلوص کا قلب پر بڑا گہرا اثر لیے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

جمرات اور ان کی راستوں کی تحقیق

ہم ہوٹل سے نکلے تو چونکہ ایک جمرہ بالکل ہوٹل کے سامنے ہی ہے اس وجہ سے خیال ہوا کہ ان کے راستوں کی اچھی طرح تحقیق کرتے چلیں تاکہ دوبارہ آنے میں آسانی ہو۔ یہ خواہش خاص طور پر اس وجہ سے ہوئی کہ پہلی رمی کے موقع پر ہم پر جو گزری تھی اس میں بہت کچھ دخل راستے کی غلطی کو بھی تھا۔ میں اب اس قسم کے کسی ابتلا سے اہلیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ پھر ان کی یہ آرزو بھی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ ان کو اطمینان سے رمی کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے جب راستوں کی تحقیق کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ حکومت نے آنے اور جانے کے لیے دو بالکل الگ الگ راستے بنا دیے ہیں اور یہ دونوں راستے اتنے چوڑے ہیں کہ اگر لوگ ضبط و نظم کا لحاظ رکھیں تو ناقابل برداشت

زحمت شاید کسی کو بھی پیش نہ آئے۔ لیکن ساری آفت یہ ہے کہ لوگ نظم و ضبط کے بالکل دشمن بن جاتے ہیں۔ میں نے جب راستوں کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو اہلیہ کو ایسے موزوں وقت میں لے جاتا کہ ذرا بھی زحمت نہ ہوتی۔

جمرات کے پاس کنکریوں کے جمع ہونے کے لیے جو ہودیاں بنی ہوتی ہیں میں نے دیکھا کہ ان میں بے شمار بڑے بڑے پتھر' جوتے اور ٹین کے ڈبے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ بعض پرجوش حاجی غصہ میں یہی چیزیں شیطان پر کھینچ مارتے ہیں۔ میں نے جب یہ چیزیں دیکھیں تو میں نے کہا اللہ اکبر' شیطان کے ہتھکنڈوں کی بھی کوئی حد نہیں ہے' اس نے مار کھاتے کھاتے بھی لوگوں کو طریق سنت سے منحرف کرنے کا ایک راستہ نکال ہی لیا۔

طواف اور سعی

اب حج کے سلسلے کا صرف ایک کام ہمارے ذمہ باقی رہ گیا تھا۔ یعنی آخری طواف اور سعی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں مکہ واپس پہنچ کر یہ سنت ادا کروں گا۔ مجھے اہلیہ کے ساتھ مکہ معظمہ جانا اور پھر منیٰ واپس آنا موجب زحمت معلوم ہوا۔ لیکن حکیم صاحب نے مجھے بتایا کہ بکثرت موٹریں اور بسیں مکہ معظمہ آ جا رہی ہیں' بڑی آسانی کے ساتھ ہم طواف اور سعی سے فارغ ہو کر واپس آ سکتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ تجویز پسند آئی اور ہم ایک ٹیکسی لے کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حجاج چونکہ ابھی تک منیٰ میں تھے' اس وجہ سے مطاف اور مسعیٰ میں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ہم بڑے اطمینان کے ساتھ طواف اور سعی سے فارغ ہوئے اور فارغ ہونے کے بعد ایک دوسری ٹیکسی کر کے منیٰ پہنچ گئے۔ بعد میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہم نے یہ کام بڑی دانش مندی کا کیا۔ اگر ہم یہ کام منیٰ سے واپسی کے بعد کے لیے اٹھا رکھتے تو بڑی مشکل میں پھنس جاتے۔ جب حجاج منیٰ سے واپس آ جاتے ہیں تو کئی دنوں تک ہم جیسوں کے لیے طواف یا سعی کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے اور عورتوں کے لیے تو سمجھیے کہ ممکن ہی نہیں رہ جاتا۔

آخری رمی اور مکہ کو واپسی

تیسرے دن رمی کر کے ہمیں مکہ معظمہ واپس ہونا تھا۔ میں نے اور میری اہلیہ نے سویرے ایسے وقت میں رمی کر لی جب ہم جیسوں کے لیے رمی کرنا ممکن تھا۔ لیکن ہمارے رفقا افضل وقت کے منتظر رہے۔ قدرتی طور پر اس دن کا ہجوم کچھ دن پہلے کے ہجوم سے بھی زیادہ تھا۔ بالخصوص زوال کا وقت ہوتے ہوتے تو کچھ ایسی شکل پیدا ہو گئی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو اس ہجوم کے اندر جائے گا وہ واپس کس طرح آئے گا۔ ہمارے رفقا اس سمندر کے اندر غائب ہو گئے اور روانگی کا مقررہ وقت گزر چلا' لیکن ان میں سے کوئی صاحب بھی نمودار نہیں ہوئے۔ میں نے یہ سارا وقفہ عقیل صاحب کے چوبارے سے ان دوستوں کی راہ دیکھنے میں گزارا اور ان کی بخیریت واپسی کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ بڑی اللہ آمین کے بعد ان میں سے دو صاحبان نمودار ہوئے تو اس حال میں کہ قمیصیں تار تار اور کسی کی ٹوپی غائب کسی کا جوتا۔ میں ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا کہ یہ لوگ زندہ واپس آ گئے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ بے چینی کے ساتھ انتظار حکیم صاحب کے لیے تھا اور ان کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں نے ان کے لیے بہت دعائیں کیں۔ میں جب ان کی طرف سے کچھ مایوس سا ہونے لگا اور میری پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکل دکھائی۔ اگرچہ اس وقت ان کا جو حلیہ بنا ہوا تھا اس کی تصویر کشی میرے قلم کے دائرہ امکان سے باہر ہے لیکن ان کی شکل دیکھ کر اس وقت مجھے جو خوشی ہوئی وہ خوشی شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

حکیم صاحب کے آنے کے بعد ہماری بس مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو گئی اور ہم شام سے پہلے پہلے اپنے مکان پر پہنچ گئے۔ ان تمام مراحل میں ہمارے معلم صاحب اور خصوصیت کے ساتھ ان کے دونوں نوجوان صاحبزادوں نے جس طرح اپنے حاجیوں کی قدم بقدم رہنمائی کی اس سے میرا دل بہت متاثر ہوا۔ اور میں نے اس کے لیے دلی خلوص کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کو جزائے خیر دے۔

حج کے بعد

ایک ماہ مکہ معظمہ میں

حج کے بعد جہازوں کی واپسی کا جو پروگرام ہمارے سفارت خانے کی طرف سے شائع ہوا اس سے معلوم ہوا کہ ابھی پورا ایک مہینہ ہمیں مکہ معظمہ میں ٹھہرنا ہے۔ اس اطلاع سے ہمیں تو فی الجملہ خوشی ہی ہوئی۔ ہم نے خیال کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس پاک سرزمین پر پہنچا دیا ہے تو یہاں قیام کا جتنا بھی موقع ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم مقررہ پروگرام سے پہلے واپسی کے لیے کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن عام طور پر لوگوں کے اندر میں نے اس کے بالکل برعکس رجحان پایا۔ حج سے فارغ ہوتے ہی میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ واپسی کے لیے اس طرح بے چین ہو گئے گویا یہ سرزمین ان کو کاٹ رہی ہے۔ حجاج کے لیے عام قاعدہ یہ ہے کہ لوگ جس جہاز سے جس ترتیب کے ساتھ جاتے ہیں عموماً اسی جہاز سے اسی ترتیب کے ساتھ واپس ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ نہایت مناسب ہے لیکن جلدباز لوگوں پر یہ شاق گزرتا ہے۔ اس قسم کے لوگ حج سے فارغ ہوتے ہی اس مقصد کے لیے تگ و دو شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح یا تو ترتیب میں ان کو پہلے جگہ مل جائے یا یہ ہو کہ اگر سمندر کے جہاز سے گئے تھے تو واپسی کے لیے ہوائی جہاز میں کوئی نشست حاصل ہو جائے۔

لوگوں کے اس عام رجحان سے فائدہ اٹھا کر معلم حضرات اور غالباً سفارت خانوں سے وابستہ ملازمین بھی دلالی کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جلدباز حاجیوں سے روپے اینٹھتے اور ان کو ان کے حسب خواہش جگہ دلا دینے کے لیے جھوٹے سچے وعدے کرتے

ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس معاملے میں لوگوں کی بے صبری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بہت سے لوگ اس کے لیے منہ مانگی رشوتیں بھی دیتے ہیں اور اپنے عزیزوں' دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ نہایت سنگدلانہ بے وفائیاں بھی کرتے ہیں۔

اس رجحان عام نے میری جان بھی ضیق میں ڈالے رکھی۔ کچھ لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے سفارت خانوں کے ذمہ داروں سے میرے تعلقات ہیں۔ غالباً یہ غلط فہمی لوگوں کو اس وجہ سے ہوئی کہ حج کے بعد جو سرکاری دعوتیں ہوتی ہیں ان کے دعوتی کارڈ مجھے بھی موصول ہوئے تھے۔ بس اس گمان کی بنا پر بہت سے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں سفارش کر کے ان کو پہلے جانے والے جہازوں میں کسی طرح بھجوا دوں۔ وہ مجھے متاثر کرنے کے لیے اپنے غم والم اور اپنی گھریلو پریشانیوں کی لمبی لمبی داستانیں سناتے اور مجھے ان کی داستانیں سننی پڑتیں۔ میں نے اس طرح کے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اول تو ان سفارت خانوں کے ذمہ دار افراد سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہے اور اگر رابطہ ہوتا بھی تو یہ بات نہایت غلط ہے کہ میں ان کے ایک صحیح کام کو خراب کرنے کے لیے ان کے پاس سفارش لے کر جاؤں۔ میرا یہ عذر بالکل واضح تھا لیکن بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ میں یہ عذر محض ان کو ٹالنے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں نے بعضوں کو یہ نصیحت بھی کی کہ خدا کے اس گھر کی زیارت کے مواقع روز روز نصیب نہیں ہوتے' اس موقع سے فائدہ اٹھایئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے کہ جہازوں کی کمی کی وجہ سے جوار بیت اللہ میں چند دن قیام کی سعادت آپ کو مزید حاصل ہو جائے گی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ طبیعتیں ایسی اکھڑی ہوئی ہیں کہ میری کوئی نصیحت بھی ان کو جمانے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔

مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر الحمدللہ اس عام رجحان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ عورتیں اس طرح کے مواقع پر کچھ زیادہ بے صبر ثابت ہوتی ہیں' اس وجہ سے مجھے اندیشہ تھا کہ اہلیہ کو کہیں اماں کی بیماری کا خیال اور لڑکی کی یاد نہ ستانا شروع کر دے' لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہیں اور اس فرصت کو اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ سمجھتی

ہیں۔ چنانچہ ہم نے طبیعت کو بالکل یکسو کر کے اپنے ایک ماہ کے قیام کا پروگرام بنایا۔

میں نے اس دوران میں دو مقصد خاص طور پر پیش نظر رکھے۔

ایک یہ کہ حجاج کا یہ ہجوم کچھ کم ہو تو ذرا اطمینان سے حرم میں بیٹھوں' بیت اللہ کا جلوہ محبوب دیکھوں' حجر اسود اور ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کروں اور ہو سکے تو اپنے چند سجدوں کا گواہ حطیم اور مقام ابراہیم کو بھی بنانے کی سعادت حاصل کروں۔ بالخصوص خانہ کعبہ کے نظارہ سے مجھے کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دروازے کے سامنے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر گدایانہ و ملتجیانہ وہ دعا مجھے جی بھر کر پڑھنے کی آرزو تھی جس میں "میں تیرے دروازے پر" کے دلکش الفاظ آتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ جب یہ ہجوم عاشقاں کچھ کم ہو گا تو ہم جیسے کمزوروں اور بے ہمتوں کی بھی شاید باری آئے۔

دوسرا یہ کہ اس دوران میں حجاز اور سعودی حکومت کے حالات اور تازہ رجحانات کا کچھ جائزہ لینے کی کوشش کروں۔ اگرچہ یہ مقصد کچھ گھومے پھرے بغیر تو کماحقہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے لیے میرے حالات مساعد نہیں تھے' تاہم حج کا اجتماع عظیم مطالعہ و مشاہدہ کے لیے بہت کچھ مواد فراہم کر دیتا ہے۔

ایک تیسرا کام حج سے فارغ ہوتے ہی آپ سے آپ نکل آیا اور وہ ہی مختلف امصار و دیار کے لوگوں سے ملنا جلنا۔ یہ کام نہ میرے پیش نظر تھا اور نہ میں نے اس کے لیے اپنے آپ کو کبھی موزوں آدمی پایا۔ لیکن حج کے بعد کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو گئیں کہ مجھے اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کچھ وقت اس کے لیے نکالنا ہی پڑا۔ اور تجربے سے اندازہ ہوا کہ یہ چیز حج کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس کے بھی کچھ فوائد ہیں بشرطیکہ آدمی اسی چیز کو مقصود و مطلوب نہ بنا لے۔

میں اب ان تینوں مذکورہ باتوں کا الگ الگ عنوانوں سے الگ الگ ذکر کروں گا اور ان میں سے آخری بات کو اس خیال سے سب سے پہلے لے رہا ہوں کہ اس سے فارغ ہو کر دوسری دو باتیں جو نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتی ہیں' کسی قدر توجہ اور تفصیل کے ساتھ لکھ سکوں۔

دعوتیں اور ملاقاتیں

اخوانی مخلصین سے ربط

سعید رمضان صاحب سے جو ملاقات منیٰ میں ہوئی اس کے بعد اخوانی مخلصین سے ربط کا دروازہ کھل گیا۔ سب سے پہلے عبداللہ بن کلیب تشریف لائے۔ یہ آئے تو اپنے ساتھ ایک صاحب کا تعارفی خط بھی لائے۔ میں نے وہ خط پڑھا اور ان سے عرض کیا کہ آپ کے لیے کسی تعارفی خط کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کی پیشانی گواہی دیتی ہے کہ آپ کا تعلق اخوان سے ہے اور اخوان سے محبت میرے نزدیک علامات ایمان میں سے ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کے خلوص نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ پھر ملاقاتوں کی تعداد جتنی ہی بڑھتی گئی میرا یہ تاثر اسی قدر بڑھتا اور مستحکم ہوتا گیا۔

یہ جدہ کی کسی کمپنی میں ملازم ہیں' وہاں سے اکثر صرف ہم سے ملنے کے لیے آتے رہتے اور جب رخصت ہوتے تو اپنے خلوص کا ایک پائدار نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ جاتے۔ یہ باتیں بہت کم کرتے ہیں' صرف کام کرتے ہیں اور دوسروں کے کام کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کا چہرہ اور انداز گفتگو تو مسکینوں کا سا ہے لیکن ان کی آنکھوں سے عزم ٹپکتا ہے۔ گفتگو کے وقت اعنی کا لفظ بطور تخن تکیہ کے باربار استعمال کرتے ہیں اور ان کی زبان سے مجھے یہ لفظ بڑا اچھا معلوم ہوتا۔ ان کے ساتھ آخر وقت تک ہمارا ربط قائم رہا اور اب ان سے ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن مرتے دم تک انشاء اللہ یہ ربط قائم رہے گا۔

ان کے دوسرے ساتھی مقبول عبدالکافی ہیں۔ شکل وشباہت میں یہ عبداللہ بن کلیب کے حقیقی بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مکہ معظمہ میں جرول کی مسجد میں امامت بھی

کرتے ہیں اور غالباً کچھ تعلیم کا شغل بھی رکھتے ہیں۔ ان کا قیام چونکہ مکہ معظمہ ہی میں تھا اس وجہ سے ان سے اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات بھی۔

ان کے علاوہ اخوان سے تعلق رکھنے والے عرب کے مختلف حصوں کے چند اور مخلصین بھی اکثر ملتے رہے۔ افسوس ہے کہ ان کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔ ان میں سے ایک نوجوان مجھ سے اکثر بحثیں بھی کیا کرتے تھے۔ یہ تعلیم یافتہ تو کچھ زیادہ نہیں تھے لیکن ذہن ایک صحافی کا رکھتے تھے اس وجہ سے حالات سے بہت باخبر تھے۔ ان کو جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے بڑا اصرار تھا۔ میں نے بہتیرا ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح اپنی ضد سے باز نہ آئے' ان کو یہ گمان تھا کہ میں صرف انتخابات کے مسئلے کی وجہ سے جماعت سے علیحدہ ہو گیا ہوں۔ بالآخر مجھے مختصر طور پر کچھ وجوہ بتانے پڑے۔ جب انھیں میرے موقف کے بارے میں اطمینان ہو گیا تو انھوں نے خود ہی مجھے اخوان کی پچھلی تاریخ سنائی جس سے میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔

اس دوران میں مجھے برابر سعید رمضان صاحب کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار رہا۔ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ انھوں نے منیٰ میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مکہ معظمہ کے فلاں ہوٹل میں ٹھہریں گے اور وہاں ہم سے تفصیلی گفتگو کریں گے۔ میں نے ہوٹل والوں سے ربط قائم کیا تو پتہ چلا کہ وہ منیٰ سے واپس آتے ہی مدینہ منورہ چلے گئے۔ بالآخر چند دنوں کے بعد عبداللہ بن کلیب کے واسطے سے مدینہ منورہ سے مجھے ان کا تار موصول ہوا کہ میں ان سے ملاقات کے لیے کوئی تردد نہ کروں' وہ خود ملاقات کی کوئی شکل مکہ معظمہ یا جدہ میں نکالیں گے۔ میں اس تار کے بعد مطمئن ہو گیا۔

ایک جمعہ کو نماز سے فارغ ہو کر میں مکان پر واپس آیا اور دسترخوان بچھا کر کھانا شروع کرنا چاہتا ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ حکیم صاحب نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ سعید رمضان صاحب اور ان کے ساتھ ان کے سیکرٹری ہیں۔ ہم نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی اس عزت افزائی سے بہت خوش ہوئے۔ وہ ہماری چھوٹی سی کوٹھڑی

کے اندر ہمارے سامانوں سے ٹیک لگا کر بے تکلف بیٹھ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آج ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے لیکن انھوں نے شکریے کے ساتھ طبیعت کی کچھ گرانی کی شکایت کی اور محض ہماری خاطر سے دو تین دانے انجیروں کے منہ میں ڈالے۔

اسی روز حرم سے نکلتے ہوئے کسی شخص نے ایک پمفلٹ مجھے پکڑایا تھا۔ یہ جمال عبدالناصر صاحب کے خلاف تھا اور اس میں ظاہر غالباً یہ کیا گیا تھا کہ یہ مصری حجاج کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ میں نے اس کو پڑھ کر کمرے میں ڈال دیا تھا۔ سعید رمضان صاحب کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس کو پڑھنے لگ گئے۔ جب وہ اس کو پڑھ چکے تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پمفلٹ آپ لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا' یہ منسوب تو ہماری طرف کیا جائے گا لیکن ہم اس سے بالکل بری ہیں۔

میں نے اس ملاقات میں خاص بات یہ محسوس کی کہ سعید رمضان صاحب نہایت متردد اور پریشان ہیں۔ منیٰ کی ملاقات میں میں نے ان کو ہشاش بشاش پایا تھا۔ اس دوران کا سب سے زیادہ اہم واقعہ عراق کا انقلاب تھا اس وجہ سے میں نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو ان کی یہ پریشانی عراق کے حوادث ہی کا نتیجہ ہے۔ مجھے منیٰ میں سعید رمضان صاحب ہی سے معلوم ہوا تھا کہ عراق کے اسلامی رہنما محمود صواف صاحب بھی حج کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے پہلے سے شرف ملاقات حاصل تھا۔ اس وجہ سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس موقع پر تجدید ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن جب میں نے ان کی بابت سوال کیا تو سعید رمضان صاحب نے ایک تشویش انگیز انداز میں فرمایا کہ وہ عراق کے موجودہ حالات کے پیش نظر فوراً واپس چلے گئے ہیں۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔

سعید رمضان صاحب عالم اسلامی کے حالات کے بارے میں اس وقت ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے میرا ارادہ تھا کہ جب ان سے ملاقات ہوگی تو میں ان سے عراق کے انقلاب کی صحیح نوعیت سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس ملاقات میں ان کو میں نے اتنا افسردہ پایا کہ کسی موضوع پر بھی کوئی گفتگو چھیڑنا میں نے مناسب نہیں خیال کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس وقت اس غریب الدیار کا اس دنیا میں وہی حال ہے جس

کی تعبیر سیدنا مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ سے فرمائی ہے کہ "سانپوں کے لیے بل ہیں اور درندوں کے لیے بھٹ' لیکن ابن آدم کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے"۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد ہم سے رخصت ہوئے اور کہا کہ اب تم ملاقات کی فکر نہ کرنا۔ میں خود اس کی فکر کر لوں گا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ان کے تشویش زدہ چہرے نے مجھے کئی دن تک پریشان رکھا اور میں ان کے لیے نمازوں کے اوقات میں برابر دعا میں کرتا رہا۔

ہمارے ان اخوانی احباب نے اپنے اپنے گھروں پر ہمیں کھانے پر بھی بلایا اور ہم نے ان کی دعوتیں بلا کسی عذر کے قبول کیں۔ ان لوگوں کے اخلاص نے ہمیں اس طرح مسخر کر لیا تھا کہ ہمارے لیے ان کی کسی بات کا انکار ممکن ہی نہیں رہ گیا تھا۔

سیٹھ احمد صاحب کی دعوت

مکہ معظمہ میں ایک دین دار اور مخیر تاجر سیٹھ احمد صاحب ہیں۔ انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے ان علما کو جو حج کے لیے آئے تھے کھانے پر بلایا۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ ان لوگوں کے لیے مل بیٹھنے اور تبادلہ خیالات کا ایک موقع فراہم کریں۔ میں تو غالباً اپنی عام عادت کے مطابق معذرت ہی کر دیتا لیکن عین وقت پر مدراس کے ایک عالم دین ——— نام غالباً مولانا عبدالباری ——— میرے مکان پر تشریف لائے اور نیچے سے یہ پیغام بھجوایا کہ میں قلب کا مریض ہوں' مجھے ڈاکٹر نے زینے پر چڑھنے سے روکا ہے' اس وجہ سے نیچے آ کر میری بات سن جاؤ۔ میں نیچے اترا تو انھوں نے فرمایا کہ اس دعوت میں شرکت کے لیے میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ تمھیں چلنا ہو گا۔ اس بیماری کی حالت میں ان کی اس تکلیف فرمائی اور ان کے اس خلوص سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ کسی معذرت کا یارا باقی نہیں رہا۔ میں اور حکیم صاحب دونوں چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیے۔

یہ دعوت نہایت پر تکلف تھی۔ سیٹھ صاحب نے نہایت عمدہ عمدہ عربی اور عجمی

کھانے کھلائے۔ اس دعوت کی چند ملاقاتیں قابل ذکر ہیں۔

ایک عرب عالم جو حرم میں درس دیتے ہیں میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کا ادبی ذوق نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ ان کا نام تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا لیکن ان کا ایک لطیفہ مجھے نہیں بھولتا۔ میرے پاس حجاز کے اخباروں میں سے کوئی اخبار پڑا ہوا تھا۔ میری نظر جدہ ریڈیو کی نشریات کے پروگرام پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اس میں تلاوت قرآن کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی ذکر ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت یہ آپ کے ریڈیو سے کون سی موسیقی نشر ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ چبھتا ہوا فقرہ فرمایا کہ "جلالۃ الملک کی حمد و نعت' اور کون سی موسیقی!"

اس دعوت میں مجھے پہلی بار مولانا قاری محمد طیب صاحب سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے اکابر دیوبند میں سے زیادہ ملنے جلنے کے مواقع صرف حضرت مولانا مدنی رحمتہ اللہ علیہ سے ملے ہیں۔ بعض امور میں ان کے نقطہ نظر سے اختلاف رکھنے کے باوجود مجھے ہمیشہ ان سے عقیدت و محبت رہی اور ان کی شفقتوں کی وجہ سے ان کے سامنے میں کسی قدر بے تکلف بھی تھا۔ دوسرے اکابر سے چونکہ مجھے زیادہ ملنے جلنے کے مواقع نہیں ملے اس وجہ سے ان سے طبیعت میں ایک قسم کا حجاب رہا۔ یہی معاملہ کچھ مولانا قاری محمد طیب صاحب کے ساتھ بھی تھا۔ مولانا کے علم و فضل کا قائل تو میں ان کے مقالات و مضامین سے تھا' ان کے تقویٰ اور دین داری اور ان کے حسن بیان کی تعریفیں دوسروں سے سنی تھیں' ان کی سادگی' بے تکلفی اور ان کے حسن اخلاق کا اندازہ اس ملاقات سے ہوا۔ اس ملاقات میں مولانا کا حسن اخلاق ہمارے لیے کچھ ایسا جرأت آموز ہوا کہ حکیم صاحب نے ایک روز ان کو اپنے ہاں چائے پینے کی بھی زحمت دی' مولانا نے اپنے صاحبزادے کی علالت اور دوسری مصروفیتوں کے باوجود یہ دعوت قبول فرمائی جس کے لیے ہم ان کے نہایت ممنون ہوئے۔

تبلیغی جماعت کا کام

اسی دعوت میں پہلی بار تبلیغی جماعت کے ان علما اور کارکنوں سے ملاقات ہوئی جو عرب میں تبلیغ دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے لیڈر مولانا سعید صاحب ہیں۔ انہوں نے اس مجلس میں نہایت مناسب موقع سے اپنے کام کے تعارف کی ایک راہ نکال لی اور بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے ان کاموں کی روداد سنائی جو نجد و حجاز کے تبلیغی دوروں میں ان کی جماعت انجام دیتی ہے۔ مجھے اس روداد سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ حجاز و نجد کے دور افتادہ قبائل تک بھی اپنی دعوت لے کر پہنچ چکے ہیں۔ اس مقصد کے عشق میں انہوں نے پہاڑوں اور صحراؤں کے خطرناک اور پرمشقت راستے بھی طے کیے ہیں اور بسااوقات مختلف قسم کی آزمائشوں میں بھی مبتلا ہوئے ہیں۔ میرے لیے ان کی روداد کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ خاص طور پر وہ تھا جس کا تعلق اہل بدو کی معاشرت' ان کی روایات' ان کے موجودہ دینی رجحانات اور اس دعوت کے ساتھ ان کی دلچسپی کی نوعیت سے تھا۔ مجھے اہل بدو کی زندگی اور ان کی معاشرت سے ابتدا سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ جاہلی شعرا میں سے ان شاعروں کے کلام کا میں بڑا دلدادہ رہا ہوں' جنہوں نے اپنے کلام میں بدویانہ زندگی کی مصوری کی ہے۔ جب یہ مجلس برخواست ہوئی تو میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اگر ان لوگوں کی معلومات اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی اور موقع ملے تو یہ بہت اچھا ہو۔

نجد و حجاز کے قبائل میں جو کام یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی افادیت کا صحیح اندازہ تو میرے لیے مشکل تھا لیکن یہ کام جس عزم و ہمت' جس ایثار وقت و مال اور جس جوش و خلوص کے ساتھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ہر سال حج کے لیے جانے والوں میں سے یہ لوگ بہت سے نوجوانوں کو اپنے تبلیغی دوروں میں رفاقت کے لیے آمادہ کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر جو مشنری اسپرٹ میں نے محسوس کی بڑی قابل قدر ہے۔ مولانا سعید صاحب نے باربار یہ خواہش کی کہ میں

قرب و جوار کی بعض بستیوں اور قصبات میں ان کے ساتھ چلنے کے لیے وقت نکالوں۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے حالات اس کے لیے سازگار نہ تھے۔ بس ایک روز اس درس میں شریک ہوا جو حرم میں ان کے زیر اہتمام ہوتا تھا۔

اس دوران میں حرم اور حجاج کے حالات کا جو مطالعہ میں نے کیا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حجاج کی خدمت اور تربیت کے بہت سے کام ایسے کیے جا سکتے ہیں جو نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی جماعت ان کاموں کے لیے اٹھے تو سعودی حکومت اس کا خیر مقدم کرے گی۔ میں نے سوچا کہ اگر تبلیغی جماعت زمانہ حج میں یہ خدمات اپنے ذمہ لے لے تو یہ اس کے مشن کے نقطہ نظر سے مناسب بھی ہیں اور مفید بھی۔ میں نے بالاجمال اپنے اس خیال کا مولانا سعید صاحب سے ذکر کیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ باتیں تفصیل کے ساتھ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی سے کرنے کی ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب

ایک کرم فرما ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کا ذکر بھی مجھے کرنا ہے۔ یہ غالباً لائل پور کے رہنے والے ہیں اور ایک مدت سے مکہ معظمہ کے الاسعاف الخیری کے اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ حکیم صاحب نے کئی مرتبہ ان کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ وہ اس عاجز سے شوق ملاقات رکھتے ہیں لیکن بیمار ہیں اس وجہ سے وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ایک دن ان کے ہاں چائے بھی پیوں اور اپنی بعض موجودہ تکالیف کے بارے میں ان کا طبی مشورہ بھی حاصل کروں۔ یہ دوسری چیز میرے لیے بڑی ترغیب کا پہلو رکھتی تھی۔ انفلوئنزا کے حملے کے بعد سے میری کھانسی کا سلسلہ ٹوٹا نہیں تھا اور اس سے مجھے خاصی تکلیف تھی۔ میں ایک دن وقت نکال کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت اور بڑے اخلاص سے ملے۔ نہایت اہتمام سے چائے پلائی۔ پھر تفصیل کے ساتھ میرا طبی معائنہ کیا اور نسخہ لکھا۔ الحمدللہ ان کے نسخے سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔

اس دعوت میں تبلیغی جماعت کے بعض ارکان سے بھی ملاقات ہوئی اور قاضی

احسان احمد صاحب شجاع آبادی سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ یہ حج کے ساتھ ساتھ رد قادیانیت کا مشن بھی اپنے سامنے رکھتے تھے۔ آدمی کو کسی چیز کی دھن ہو تو ایسی ہو۔

میری خواہش کے خلاف جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے وجوہ سے متعلق بھی بعض لوگوں نے سوالات کیے۔ میں نے کہا کہ میں اسلام کی سرپرستی کا نظریہ نہیں رکھتا بلکہ اسلام کی خدمت کا نظریہ رکھتا ہوں اور اسلام کی خدمت کے بنیادی اصول میرے نزدیک یہ ہیں۔ میں نے خدمت اسلام کے یہ اصول اجمال کے ساتھ بیان کر دیے۔

ملک عبدالحق صاحب

ملک عبدالحق صاحب کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ انھوں نے متعدد بار ہمیں کھانے اور ناشتے پر بلایا۔ ان کے ہاں تبلیغی جماعت کے علما اور کارکنوں سے پھر ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے قبائل میں ان کے تبلیغی دوروں کی وہ دلچسپ اور موثر داستان مکمل کرائی جو سیٹھ احمد صاحب کی دعوت میں ناتمام رہ گئی تھی۔ ملک عبدالحق صاحب نے اس سفر میں شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ نہایت مخلصانہ اور برادرانہ سلوک کیا۔

ڈاکٹر احمد علی صاحب

ڈاکٹر صاحب کے الطاف سے یوں تو ہم اس دوران میں برابر متمتع ہوتے رہے تھے لیکن ضابطے کی دعوت ان کے ہاں ابھی باقی تھی اور یہ ہماری مصروفیتوں کے سبب سے ٹلتی جا رہی تھی۔ اب مزید ٹالنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی اس وجہ سے انھوں نے ایک دن مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں خاص پنجاب کے لوگوں کے ذوق کے نہایت لذیذ کھانے کھلائے۔

اس دعوت میں مولانا اسمٰعیل صاحب غزنوی سے ملاقات ہوئی اور یہ موصوف سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس دعوت میں ڈاکٹر صاحب کے ایک عرب دوست بھی تھے۔ انھوں نے اپنے کسی چھوٹے بچے کو تعلیم و تربیت کے لیے مصر بھیج رکھا تھا۔ انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ

اس کا ایک فقرہ سنایا جس کے سنانے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ بچہ اب اہل مصر کے مخصوص محاورات بولنے لگا ہے۔ اس سے مجھے اس علمی رعب اور اثر کا اندازہ ہوا جو مصر کا اہل حجاز پر اس وقت قائم ہو چکا ہے۔

ان عرب صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی مجھے نہیں بھولتا۔ عرب کے خوشحال لوگوں کے گھروں میں تمدنی سامانوں کی کثرت کا کچھ ذکر چلا تو انھوں نے یہ مزیدار فقرہ کہا کہ ہمارے گھروں میں تو امریکہ کی بنی ہوئی وہ چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو اہل امریکہ کے گھروں میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت پسند آیا۔ میرے نزدیک یہ صحیح مبالغہ کی ایک بلیغ ترین مثال ہے۔

زکریا صابر سیلمہ

ایک روز میں عشا کی نماز پڑھ کر اٹھا تو جاوی وضع قطع کے ایک نوجوان مجھ سے لپٹ گئے۔ جب میں کچھ حیران سا ہوا تو وہ بولے کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں' آپ تو میرے باپ اور میرے بزرگ ہیں۔ میں ساٹرا کا رہنے والا زکریا صابر ہوں اور مدرسۃ الاصلاح (اعظم گڑھ) میں دو سال آپ کی تربیت میں رہ چکا ہوں۔ میں نے جب انھیں پہچانا تو جوش محبت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ فی الواقع مدرسۃ الاصلاح میں میری نگرانی میں رہ چکے تھے اور ان کی نیکی و سعادت مندی کا میں بڑا قدردان تھا۔ پھر یہ اپنے وطن واپس چلے گئے تھے اور وہاں اپنی صلاحیت کے مطابق دین کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کی بعض چیزیں اپنی ملکی زبان میں منتقل کیں۔ جاپان کے حملے کے زمانے میں یہ مختلف مصائب میں مبتلا ہوئے۔ اس ابتلا سے چھوٹے تو ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں خدا کے فضل سے اب اپنا مکان رکھتے ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہیں۔ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو باصرار کھانے پر بلایا۔ جب میں دسترخوان پر بیٹھا تو انھوں نے بتایا کہ بعض چیزیں میری پسند کی انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے تیار کی ہیں۔ میرے دل میں ان کے اس خلوص کی بڑی قدر ہوئی۔ میں نے خیال

کیا کہ کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں خود تو میں بالکل بے حس اور بے ذوق واقع ہوا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے احباب دیے ہیں جو اتنی طویل جدائی کے بعد بھی میرے ذوق کا خیال رکھتے ہیں اور اس کے لیے اہتمام کرتے ہیں۔

ان عزیز سے جب سے ملاقات ہوئی یہ ہمارے لیے دودھ کی بوتلیں بھیجنے لگے۔ یہ دودھ بکریوں کا ہوتا تھا لیکن نہایت اچھا ہوتا تھا۔ میں یہاں کی بکریوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا کہ آگے پیچھے چار سوکھی سوکھی لکڑیاں گاڑ کر ان پر ایک کھال سوکھنے کے لیے ڈال دی گئی ہے لیکن انھی سوکھی سوکھی بکریوں کے نیچے قدرت نے دودھ کی بوتلیں لٹکا رکھی ہیں۔

شیخ ہیئتہ امربالمعروف

اس دوران میں حجاج اور حرم سے متعلق جو چیزیں میں نے محتاج اصلاح محسوس کیں حکیم صاحب کا اصرار تھا کہ ان کو حکومت کے ذمہ داروں کے علم میں لانا ضروری ہے۔ میرے لیے یہ کام نہایت مشکل تھا لیکن یہ ایک اسلامی فرض تھا اس وجہ سے مجھے حکیم صاحب کی بات ماننی پڑی اور میں ایک روز سعودی عرب کے شعبہ امربالمعروف والنہی عن المنکر کے صدر سے ان کے دفتر میں ملا۔ شیخ اپنے روایتی اخلاق سے ساتھ ملے۔ گفتگو کا موقع دیا لیکن اس وقت ان کے دفتر میں دوسرے ضرورت مند بھی موجود تھے۔ میں ان کے سامنے ان اصلاحی مسائل کا چھیڑنا مناسب نہیں خیال کرتا تھا اس وجہ سے میں نے یہ کہہ کے اجازت چاہی کہ میں ان شاء اللہ پھر کسی مناسب موقع پر حاضر ہوں گا۔ شیخ نے جب یہ محسوس کیا کہ میں علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے کہلایا کہ اگر دوسروں کی موجودگی گفتگو سے مانع ہے تو ان لوگوں کو ہٹایا بھی جا سکتا ہے لیکن میں نے یہی پسند کیا کہ کسی وقت شیخ سے ان کے مکان پر ملاقات کی جائے۔ چنانچہ شیخ نے فرمایا کہ میں جدہ جا رہا ہوں' وہاں سے فلاں روز واپس ہوں گا' اس کے بعد ہم ان کے مکان پر ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم شیخ کے مکان پر تو حاضر ہونے کا موقع نہ نکال سکے لیکن ایک روز ان کے نائب صاحب نے ازراہ نوازش ہمیں ناشتے کی دعوت دی اور اس طرح ہمیں ساری باتیں تفصیل کے ساتھ شیخ تک پہنچانے کے لیے ایک قابل اعتماد واسطہ مل گیا۔ ہم نے وہ باتیں ان سے عرض کر دیں جو اس دوران میں ہم نے محتاج اصلاح محسوس کی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم نے شعبہ امربالمعروف کے سامنے بعض مفید تجویزیں بھی پیش کیں جن کو اگر شعبہ عملی جامہ پہنا سکے تو ہمارے خیال میں بہت مفید ہو سکتی ہیں۔ ان باتوں کا ذکر مناسب موقع سے آگے آئے گا۔

متفرق ملاقاتیں

ان کی علاوہ دو تین مخلصین نے اپنے اپنے گھروں پر چائے پر بلایا لیکن مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے۔

مدرسہ شرعیہ ریاض کے چند فارغین برابر ملتے رہے۔ ان میں سے دو مخلصین کا تعلق تو مالابار کے علاقے سے تھا اور ایک ہمارے پاکستان ہی کے رہنے والے ہیں۔ ان کا اسم گرامی مولانا محمد شریف ہے۔ ان نوجوانوں کے اخلاص اور ان کے علم و فضل کے سبب سے ان سے ایک خاص قسم کا قلبی ربط قائم ہو گیا۔

بعض پاکستانی نوجوان جو مصر یا دمشق میں زیر تعلیم ہیں وہ بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔

سیلون کی جماعت اسلامی کے امیر اپنے بعض رفقا کے ساتھ حج کے لیے آئے تھے ان لوگوں کو جب میرا پتہ چلا تو برابر میری قیام گاہ پر بھی اور حرم میں بھی یہ لوگ مجھ سے نہایت محبت سے ملتے رہے۔ میں مغرب اور عشا کی نمازوں کے درمیان عموماً باب بنی شیبہ کے پاس والے کنکریوں کے پلاٹ میں یا مقام ابراہیم کے پاس بیٹھتا۔ یہ مخلصین بھی وہیں جمع ہو جاتے اور مختلف علمی و مذہبی مسائل سے متعلق سوالات کرتے۔

بمبئی اور سورت کے علاقوں کے کچھ مخلصین بھی بڑی محبت سے ملتے رہے۔

مختلف اسلامی تحریکات سے وابستہ یہ حضرات جب جمع ہو جاتے تو عجیب لطف آتا۔

کچھ لوگ عربی میں اپنے سوالات پیش کرتے، کچھ انگریزی میں اور کچھ اردو میں۔ زبانیں مختلف ہوتیں لیکن مسائل کم وبیش ایک ہی طرح کے۔ یہ صحبتیں چند ہی دنوں رہیں لیکن ان تمام ملنے والوں سے کچھ ایسا ربط قلبی سا ہو گیا تھا کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے وطنوں کو رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ہر ایک کی جدائی میرے دل پر شاق گزری۔ میری دلی دعا ہے کہ اسلامی رشتے کے یہ عزیز جہاں بھی ہوں خوش اور مطمئن رہیں اور ان کی قوتیں اور قابلیتیں اللہ کے دین کی خدمت میں صرف ہوں۔

مشاہدات حرم

منیٰ سے واپسی کے بعد ایک ہفتہ تک تو حرم میں میری حاضری بس ضابطے کی حاضری رہی۔ اتنا ازدحام ہوتا کہ حرم میں سکون سے بیٹھنے اور اطمینان سے طواف کرنے کی آرزو پوری ہونا تو درکنار فرض نمازیں ادا کرنے کے لیے بھی موزوں جگہ حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ کبھی کسی سڑک پر جانماز بچھالی کبھی کسی دروازے کی سیڑھیوں پر۔ میں نے طواف کے لیے شب کے مختلف حصوں میں پہنچنے کی کوشش کی لیکن کسی وقت بھی مطاف کا تلاطم کم نہیں پایا۔ مکہ میں مکانوں کی قلت اور ان کے گھٹے ہوئے کمروں کی گرمی کے سبب سے عام حجاج سوتے بھی زیادہ تر حرم ہی میں ہیں اس وجہ سے خاص ایام حج کے آگے پیچھے تو حرم میں سونے والوں کی بھی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ شب میں آدمی اگر جا کر نفل پڑھنا چاہے تو بڑی مشکل سے موزوں جگہ ملتی ہے۔ دو ہفتے گزرنے کے بعد اندرون ملک کے حجاج کے رخصت ہو جانے اور کچھ باہر کے حجاج کے چلے جانے کے سبب سے حرم کے اندر اتنی گنجائش پیدا ہوئی کہ صبح شام وہاں بیٹھنے کا موقع ملنے لگا۔ میں زیادہ تر اس پلاٹ میں بیٹھتا جس میں جاوا اور ملایا کے حجاج بیٹھتے۔ یہ لوگ بڑے حلیم اور بردبار ہوتے ہیں۔ حرم کے آداب کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ میں نے ان کو لڑتے جھگڑتے تو درکنار کبھی زیادہ باتیں کرتے بھی نہیں پایا۔ ان کی خواتین میں بھی زیادہ آزادی اور بے باکی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں پردہ کی پابند نہیں ہیں لیکن حرم میں چہرے کے سوا اپنے ہر حصہ جسم کو ڈھانکے رکھنے کا بڑا اہتمام کرتی ہیں۔ طواف کے اوقات میں بھی حتی الامکان تصادم سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بیت اللہ کا جلوہ

میں اوپر یہ عرض کر چکا ہوں کہ حرم میں میری سب سے زیادہ دلچسپی بیت اللہ کے جلوہ سے رہی۔ بیت اللہ کی محبوبیت اور دلکشی اور طواف کا منظر، یہ دو چیزیں بھولنے والی نہیں ہیں۔

بیت اللہ کی جلوہ نمائی کا طریقہ بھی خوب اختیار کیا گیا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب حجاج کے ورود کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو دروازے کی طرف سے تھوڑا تھوڑا پردہ سرکنا شروع ہوتا ہے ہر صبح کو جب آپ حرم میں داخل ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ کل کی نسبت سے آج کی شب نئے چہرے کا کچھ حصہ بے نقاب کر دیا ہے۔ اسی تدریج کے ساتھ یہ معاملہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ منیٰ کی روانگی کا دن آتے آتے تھوڑے سے بالائی حصہ کے سوا سارا بیتِ اللہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پھر جب حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں تو جلالۃ الملک اپنی نگرانی اور بیرونی سفرا کی موجودگی میں خانہ کعبہ کو غسل دلاتے اور نیا غلاف پہناتے ہیں۔ اس نئے غلاف کی لیے بھی رسم یہ ہے کہ یہ بتدریج نہایت آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ آپ ہر روز صبح کو جب حرم میں داخل ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ کلّ جو بات تھی آج وہ باقی نہیں رہی ہے۔ حسن کا حلقہ کل کی نسبت سے آج کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔

میرے دل نے ان دونوں حالتوں کا نہایت گہرا اثر قبول کیا۔ میں حج سے پہلے پہلے بیت اللہ کے سامنے سراپا شوق بن کر بیٹھتا اور حج کے بعد سراپا حسرت بن کر!

حجر اسود پر

میں نے تمام حج میں حجر اسود پر پہنچنے کے لیے کبھی کشمکش نہیں کی۔ اگر بغیر کسی کشمکش کے پہنچنے کا موقع مل جاتا تو تقبیل کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو لیتا ورنہ آرزومندانہ گزر جاتا۔ بالآخر جب حجاج کی بڑی تعداد رخصت ہو گئی تو بغیر کسی کشمکش کے پہنچنے کے مواقع ملنے لگے۔ یہاں تک کہ آخر میں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ

طواف کے ہر پھیرے میں یہ سعادت حاصل ہو جاتی۔ بالخصوص نماز فجر سے پہلے اور صبح کے آٹھ نو کے درمیان جو طواف میں کرتا ان میں تو نہ رکن یمانی پر پہنچنے میں کوئی زحمت ہوتی نہ حجراسود پر۔ یہ ساری برکتیں اس بات کا نتیجہ تھیں کہ حج کے بعد ہمیں کچھ موقع جوار حرم مین قیام کا نصیب ہو گیا۔

ملتزم پر

ہجوم کم ہو جانے کے بعد ملتزم پر پہنچنے کے مواقع بھی نصیب ہونے لگے۔ ایک روز میں مقام ابراہیم کے پاس اس انتظار میں کھڑا ہوا کہ گنجائش نکلے تو ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کروں۔ اللہ تعالٰی کی مہربانی سے ذرا سا موقع پیدا ہوا تو میں جھپٹ کے پہنچ گیا۔ اس وقت دھوپ تھی' اس وجہ سے خانہ کعبہ کی دیوار تپ رہی تھی۔ میں نے تپتی ہوئی دیوار پر اپنا چہرہ رکھ دیا اور بے تکلف میری زبان سے یہ دعا نکلی کہ اے رب تو اس گھر کی برکت سے اس چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچا۔ اس دعا میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا' بلکہ یہ اس وقت ازخود میری زبان پر جاری ہو گئی اور اس سے میرے دل کو اطمینان کی ایسی ٹھنڈک نصیب ہوئی کہ میں عموماً دھوپ ہی میں ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کرتا اور اگر دیکھتا کہ زیادہ لمبی چوڑی دعا مانگنے کا موقع نہیں ہے تو بس اتنی ہی دعا پر کفایت کر لیتا۔ میں نے اس جگہ اللہ کے بندوں اور بندیوں کی ایسی رقت انگیز دعائیں بھی سنیں جن کو سن کر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ دعائیں براہ راست اس گھر کے رب کی طرف سے مانگنے والوں اور مانگنے والیوں کے دلوں اور زبانون پر القا ہو رہی ہیں۔ بعض لوگ اس طرح زاروقطار روتے کہ ان کی حالت دیکھ کر دل اللہ تعالٰی کے ایمان ویقین سے لبریز ہو جاتا۔ بہت سے لوگ اپنی صورت وہیئت سے بالکل بے علم معلوم ہوتے تھے لیکن ان کا سوزوگداز بڑے بڑوں کے لیے قابل رشک ہوتا۔ خانہ کعبہ کا ماحول رو رو کر دعائیں کرنے والوں سے ہر وقت اس طرح آباد رہتا ہے کہ بے حس سے بے حس انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے وہاں بدل جاتا ہے۔ وہاں صاف نظر آتا ہے کہ الحاد اور بے دینی سے بھری ہوئی اس دنیا

میں خدا کو صدق دل سے ماننے والے اور اس سے ڈرنے والے اب بھی موجود ہیں۔

حطیم میں

میں حطیم میں بہت کم جاتا تھا۔ میری اہلیہ زیادہ تر حطیم میں بیٹھتی تھیں اور ان کو وہاں بیٹھنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے میرے اوپر باربار یہ اعتراض کیا کہ میں حطیم پر بہت کم جاتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہاں عورتیں زیادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے مجھے وہاں جانے میں تکلف ہوتا ہے لیکن وہ مصر ہوئیں کہ مجھے حطیم میں ضرور دعا اور نفل کے لیے جانا چاہیے۔ آخرکار سب اوقات میں تھوڑی دیر میں حطیم میں بھی بیٹھنے لگا۔ ایک دن میرے دل میں خیال آیا اس حطیم کا کل حصہ یا اس کا اکثر حصہ بہرحال بیت اللہ کا جزو ہے' اگر اللہ تعالٰی چاہتا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیتا اور آپ اس کو بیت اللہ میں شامل کر دیتے۔ خود حضور کے متعلق بھی معلوم ہے کہ حضور اس حصے کو بیت اللہ میں شامل کرنا پسند فرماتے تھے لیکن پسند فرمانے کے باوجود آپ نے اس کو شامل نہیں فرمایا حالانکہ اگر حضور یہ کر دیتے تو کوئی آپ کے اس ارادے میں مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخ میں ایک بار یہ خانہ کعبہ میں شامل بھی کیا جا چکا ہے لیکن پھر یہ اپنی سابق حالت میں کر دیا گیا۔ میں نے خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے' اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ ہم جیسے کمزوروں کا حصہ ہے۔ اگر یہ خانہ کعبہ میں شامل کر دیا گیا ہوتا تو بھلا ہم جیسے کس مپرسوں کو اس مقدس ٹکڑے پر سجدہ کرنے کی سعادت.... کہاں حاصل ہو پاتی۔ ایک روز ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ آپ بیت اللہ کے اندر نہیں گئے۔ میں نے کہا میرے یہ نصیب کہاں۔ البتہ تھوڑی دیر حطیم میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور میرے لیے یہ درد تہہ جام ہی بہت ہے۔

بیت اللہ کے اندر

بیت اللہ کے اندر داخل ہونے کی آرزو بھلا کس مسلمان کے دل میں نہ ہو گی۔ میں نے اس آرزو کا اظہار تو کسی پر نہیں کیا لیکن دل میں اس کو رکھا برابر۔ حج کے بعد ایک

روز جب میں طواف کے لیے گیا تو میں نے دیکھا کہ بیت اللہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے' سامنے ایک چھوٹی سی لکڑی کی سیڑھی لگی ہوئی ہے' داخل ہونے والوں کا ہجوم ہے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ جو اندر ہیں وہ دھکے دے کر نکالے جا رہے ہیں' جو باہر ہیں وہ سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں' بچے چیخ رہے ہیں' عورتیں شور کر رہی ہیں' مرد ہاتھا پائی کر رہے ہیں اور کلیدبردار صاحب اور ان کے آدمی بخشیش وصول کر رہے ہیں اور جن سے بخشیش نہیں مل رہی ہے ان کو دھکے دے رہے ہیں اس منظر کو دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ دل میں کر لیا کہ اگر اس سب سے محترم گھر میں داخل ہونے کے لیے ان ناگوار حالات سے گزرنا ہے تو میں اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ اتفاق کی بات کہ جو وقت میرے طواف کا تھا وہی وقت کلیدبردار صاحب نے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولنے کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ میں اس طرح کا منظر روز دیکھتا اور اس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی لیکن بیت اللہ کے اندر داخل ہونے کی آرزو بڑی شدید ہوتی ہے اس وجہ سے ان تمام ناگواریوں کے باوجود طواف کرتے ہوئے جب میں بیت اللہ کے دروازے کے سامنے سے گزرتا تو دروازے کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گزرتا کہ شاید کسی دن اس گناہ گار کی باریابی بھی ہو جائے لیکن یہ سعادت میری قسمت میں نہیں تھی۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ داخل ہونے والوں کی کشمکش اس قدر بڑھ گئی ہے کہ چند آدمی عین بیت اللہ کے دروازے پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے' ایک صاحب کی تہمد نیچے گر گئی اور ایک صاحب کو چوٹ بھی آئی۔ بالآخر حرم کی پولیس کو مداخلت کرنا پڑی تب کہیں جا کے معاملہ رفع دفع ہوا۔ میرے اوپر اس واقعہ کا اس قدر سخت اثر پڑا کہ میں طواف ناتمام چھوڑ کر دور جا کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں اس بات سے بالکل مایوس ہو گیا کہ حرم کے اندر داخل ہونے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہو سکے گی۔ اس مایوسی کے بعد حطیم سے میری دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ان ناگوار حالات کی شکایت میں نے شعبہ امربالمعروف کے نائب صاحب سے کی۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ کلیدبردار صاحب کو تو اس طرح بیت اللہ کا دروازہ کھولنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے مفاد کے لیے من مانے طور پر اس طرح کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کا ختم ہونا ضروری ہے۔ یہ بیت اللہ کے احترام کے بالکل منافی ہے۔ اس کے بجائے کوئی ایسی شکل اختیار کرنی چاہیے جس سے ہر آرزومند کی آرزو کم از کم ایک مرتبہ حج کے موقع پر پوری ہو سکے۔ حکومت اگر چاہے تو ایسی کوئی شکل بڑی آسانی سے اختیار کر سکتی ہے۔

اہل مکہ اور حرم

حج سے پہلے تک میرا احساس یہ تھا کہ اہل مکہ حرم کی حاضری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے لیکن حج کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کی دلچسپی کچھ بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ اہل مکہ کی خواتین بھی خاص خاص دنوں میں زیادہ آنے لگی ہیں اور مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے بعض لوگوں کے سامنے اپنے اس احساس کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ حج کے دنوں میں اہل مکہ حاجیوں کے لیے یہ "ایثار" کرتے ہیں کہ وہ حرم میں کم آتے ہیں۔

حج کے بعد خاص طور پر یہ لوگ جمعرات کی شام کو حرم میں زیادہ آنے لگے۔ عورتوں کا پلاٹ بھی اہل مکہ کی خواتین سے بھر جاتا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جمعرات ان لوگوں کے لیے بھی عبادت کے لیے خاص سمجھی جاتی ہے۔

حرم میں تقریریں اور درس

حرم میں حجاج کی تعلیم و تربیت کی غرض سے اس دوران میں کچھ تقریروں اور درس کا اہتمام بھی ہوتا ہے لیکن جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں یہ تقریریں اور یہ درس کچھ زیادہ موثر نہیں ہوتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سعودی حکومت ایک منصوبے کے تحت اس کام کو کرے اور اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حجاج ان دو تین مہینوں کے اندر جو وہ حرمین میں گزارتے ہیں' قدم قدم پر کچھ نہ کچھ سیکھیں۔ حج کے دوران میں

حاجیوں کے اندر دین سیکھنے کا رجحان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس رجحان سے ان تمام لوگوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے جن پر تعلیم دین کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ حاجیوں سے متعلق سعودی حکومت پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔

ان تقریروں میں کچھ حصہ ہمارے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے بھی لیا اور اپنی ایک تقریر میں توحید کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مردہ خداؤں کے ساتھ ساتھ زندہ خداؤں پر بھی تنقید کر ڈالی اور اس ضمن میں شاید جلالتہ الملک کا بھی حوالہ دے ڈالا۔ ہمارے ایک ساتھی بھاگے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب کی خبر لیجیے انہوں نے آج اپنی تقریر میں جلالتہ الملک کا بھی نام لیا ہے' اگر جلالتہ الملک کی سی آئی ڈی متوجہ ہو گئی تو کیا ہو گا؟ میں نے ان سے کہا کہ آپ مطمئن رہیں' کچھ بھی نہیں ہو گا' حکیم صاحب جانتے ہیں کہ حکومت ان کے گھر کی ہے۔ بالفرض ان کی تقریر قابل اعتراض بھی ہوئی تو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو گا۔ حکیم صاحب پروگرام سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔

جلالتہ الملک کا طواف

اسی دوران میں ایک روز جلالتہ الملک اپنے ورزا اور حکام کے ساتھ طواف کے لیے تشریف لائے۔ جو دن ان کے طواف کے لیے مقرر تھا اس دن صبح ہی سے حرم اور اس کے قرب و جوار میں فوجی دستے نظر آنے لگے۔ عصر کے وقت میں نے دیکھا کہ حرم کی چھتوں' اس سے متصل سڑکوں اور حرم کے تمام گوشوں اور کونوں میں فوج کے آدمی کھڑے ہیں۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان میں نے اپنے ایک طواف کا وقت مقرر کر رکھا تھا' اس دن جو پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج اسی وقت جلالتہ الملک طواف کریں گے۔ اگلا زمانہ ہوتا تو ایک بادشاہ اور ایک گدا دونوں بغیر کسی زحمت کے ایک ہی وقت میں طواف کر سکتے تھے لیکن اس زمانے میں تو اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ آج میرے طواف کا موقع نہیں ہے' تو مطاف کے پلیٹ فارم پر بادشاہ

ے طواف کی سیر کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مطاف اور مطاف میں داخل ہونے کا ایک طرف کا راستہ عام آدمیوں سے بالکل خالی کرا لیا گیا تھا۔ راستے اور مطاف کو ہر طرف سے نجدی فوج کے سپاہیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پہلے جلالتہ الملک کے کچھ مقربین آئے اور وہ کچھ دیر تک طواف کرتے رہے۔ اس کے بعد جلالتہ الملک' ان کے وزرا اور اعلیٰ حکام آئے اور انہوں نے طواف کیا۔

طواف کے بعد جلالتہ الملک اور ان کے ساتھیوں نے مغرب کی نماز حرم میں پڑھی' پہلی رکعت کی سجدے سے جب میں نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف سے کچھ مسلح فدائی اثنائے نماز میں بھی صفوں کے درمیان جلالتہ الملک کی نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بادشاہ ہونا کتنی بڑی مصیبت ہے۔ عین حرم الٰہی میں جب میں نے دیکھا کہ جلالتہ الملک کی ذات کے لیے اتنے خطرے ہیں تو میں نے اپنی خوش قسمتی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میں اس کی عنایت سے کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔

آگ کا حادثہ

جس دن جلالتہ الملک طواف کے لیے آئے اسی دن مکہ معظمہ کی تاریخ کا ایک بہت بڑا حادثہ ظہور میں آیا۔ جلالتہ الملک طواف اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد طائف کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں حرم میں ہم جوں ہی عشا کی نماز سے فارغ ہوئے حرم کے بالکل پاس کے ایک مکان سے دفعتاً آگ کے شعلے نمودار ہوئے۔ آناً فاناً یہ آگ پورے ایک محلے میں پھیل گئی۔ یہ محلہ بہت ہی گنجان آباد تھا اور دکانیں بھی بڑی بڑی زیادہ تر اسی محلے میں تھیں۔ مکہ کا فائر بریگیڈ اگرچہ وقت پر پہنچ گیا لیکن تنگ گلیوں کے اندر اس کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ دور سے جو پانی پھینکنے کی کوشش کی جاتی آگ کے شعلے اس کو گرنے سے پہلے ہی بھاپ بنا کر اڑا دیتے۔ دیکھتے دیکھتے یہ آگ ان عمارتوں تک پہنچ گئی جن کی کھڑکیاں حرم کی چھتوں پر کھلتی تھیں۔ ہر طرف واویلا مچ گیا۔ بچے' جوان' عورتیں' مرد سب ادھر ادھر بھاگنے

لگے۔ میں نے باب ابراہیم کے سامنے والی سڑک سے آگ کے صحیح موقع کا اندزہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اب حرم (صانہ اللہ) بھی آگ کی زد میں ہے۔ آگ کے اتنے بڑے بڑے انگارے فضا میں اڑتے تھے کہ جس مکان پر وہ گرتے ان سے آگ لگ سکتی تھی۔ مجھے جب یہ خیال آیا کہ خدانخواستہ یہ انگارے بیت اللہ پر بھی گر سکتے ہیں تو میرا دل بیٹھنے لگ گیا۔ میں نے اور میری اہلیہ نے سڑک کے کنارے بیٹھ کر یانار کونی برداً و سلامًا کا ورد شروع کر دیا۔ میری خاص دعا انتہائی بے قراری کے ساتھ بس یہ تھی کہ اے رب ابراہیم' حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے اس گھر کو تو آگ سے محفوظ رکھ۔ جب آگ کا زور زیادہ بڑھا اور معلوم ہوا کہ سارا مکہ اس کی لپیٹ میں آجائے گا تو میری اہلیہ نے کہا کہ حرم میں چلو اور غلاف کعبہ پکڑ کر دعا کرو۔ ہم دونوں حرم میں پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ لوگ اپنی مکانوں کے سامان کھڑکیوں سے حرم کی چھتوں پر پھینک رہے ہیں اور آگ پورے زور کے ساتھ بڑھتی آ رہی ہے' یہاں تک کہ حرم کا کتب خانہ اور اس کا ایک طرف کا سامان بھی لا لا کے صحن میں ڈالا جا رہا ہے لیکن مطاف میں طواف کرنے والوں کا وہی حال ہے جو عام حالات میں ہوا کرتا ہے۔ گویا انھیں اس حادثہ کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ ایسے نازک موقع پر دلوں کا یہ اطمینان میں نے اسی گھر میں دیکھا۔

حکومت کے ذمہ داروں نے جب دیکھا کہ معاملہ مکہ کے فائر بریگیڈ کے قابو سے باہر ہے تو انہوں نے جدہ بھی اطلاع بھیج دی اور فوج بھی بلا لی۔ علاوہ ازیں امیر فیصل کو بھی اطلاع کر دی جو جلالتہ الملک کے ساتھ طائف جا رہے تھے اور ابھی کہیں راستے ہی میں تھے۔ جدہ کا فائر بریگیڈ جب پہنچا تو اس نے ہر طرف سے آگ کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی اور اس کی کوشش نتیجہ خیز ہوئی۔ اس نے ایک تدبیر یہ بھی کہ حرم کا ایک دروازہ توڑ کر اپنے انجن اور پانی کی گاڑیاں حرم کے اندر گھسا دیں۔ اس پر حرم کے منتظمین کو ابتداً کچھ اعتراض ہوا لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ یہ تدبیر اختیار کیے بغیر اب حرم بلکہ خود مکہ کو بھی بچانا مشکل ہے تو مجبوراً

انھیں اجازت دینی پڑی۔ یہ تدبیر بہت کامیاب رہی۔ فائر بریگیڈ والوں نے اذان کے میناروں پر چڑھ کر جب پانی پھینکنا شروع کیا تب محسوس ہوا کہ اب آگ کا تمرد کچھ دھیما پڑنا شروع ہوا۔

یہ آگ سب سے زیادہ گنجان اور آباد محلہ میں لگی تھی اس وجہ سے مالی نقصان بھی بہت ہوا اور جانیں بھی بہت ضائع ہوئیں لیکن پریس میں اس کی تفصیلات نہیں آئیں۔ پہلے تو یہ بات ہمیں کچھ قابل اعتراض معلوم ہوئی کہ اتنے بڑے حادثے کو حکومت نے چھپانے کی کوشش کی لیکن بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ سعودی حکومت نے یہ کام بڑی دانش مندی کا کیا۔ یہ زمانہ حج کا تھا۔ اگر اس حادثے کی تفصیلات اخباروں میں چھپتیں تو ہر ملک کے وہ سارے لوگ سخت تشویش و پریشانی میں مبتلا ہو جاتے جن کے عزیز یا دوست حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ امیر فیصل کو راستہ میں جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنا سفر منسوخ کر کے راتوں رات مکہ معظمہ واپس آ گئے' اور فوراً متاثر علاقہ میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی بھی کی اور پوری فیاضی کے ساتھ تمام نقصانات کے معاوضے دینے کا بھی اعلان کر دیا۔

بعد میں جب اس حادثے کی تحقیقات ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اس عظیم حادثے کا اصلی سبب ایک صاحب کی معمولی سی غفلت ہے۔ ایک حاجی صاحب اپنا سٹوو جلتا ہوا چھوڑ کر حرم میں عشا کی نماز پڑھنے چلے آئے۔ اسٹوو پھٹ گیا اور اس کے پھٹنے سے پاس پڑے ہوئے سامان نے آگ پکڑ لی۔ مکہ کے عام دکانوں کی تعمیر میں میرا اندازہ ہے کہ لکڑی کا استعمال بہت غلط طریقے پر ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چھتیں ہوتی ہیں اور ان کے پردے عموماً لکڑی کے پھٹوں کے ہوتے ہیں۔ کوئی بداحتیاط آدمی اگر چھت پر کھانا پکائے تو اس کی معمولی سی بے احتیاطی سے مکہ کی گرم و خشک ہوا میں ان لکڑیوں میں آگ لگ سکتی ہے۔ حاجی بے چارے اول تو عام طور پر اسٹوو وغیرہ کے استعمال کے معاملے میں اناڑی ہوتے ہیں۔ دوسرے اناڑی نہ بھی ہوں تو

ہر شخص میں اتنی احتیاط کہاں ہوتی ہے کہ وہ کسی چیز کے نتائج اتنی دور تک سوچ سکے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کے قیام کا موجودہ نظام نہایت ناقص ہے۔ حجاج کے قیام کے لیے حکومت کو اپنے اہتمام میں مکانات بنوانے چاہئیں۔ اور اگر فی الحال موجودہ سسٹم ہی کو باقی رکھنا ناگزیر ہو تو پھر کم از کم جو لوگ نئے مکانات کرایے پر چلانے کے لیے بنائیں ان کو کچھ ضروری شرائط کا پابند کرنا چاہیے۔

سعودی حکومت کی بعض خدمات

سعودی حکومت کی چند خدمات بڑی قابل قدر ہیں۔ میں ان میں سے بعض کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سعودی حکومت کی سب سے زیادہ نمایاں خدمت حرمین شریفین کی توسیع و تجدید ہے۔ مسجد نبوی اور حرم مکہ کی تعمیر و توسیع میں' اپنے زمانے میں' ترکوں نے بھی بڑے نمایاں کام کیے تھے' لیکن سعودی حکومت نے اپنے دور میں جو خدمات انجام دی ہیں اور جو انجام دے رہی ہے اگر وہ پیش نظر اسکیم کے مطابق تکمیل کو پہنچ جائیں' تو ان کے سامنے نہ صرف تمام پچھلی خدمات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جائے گی بلکہ مستقبل کی تاریخ میں بھی یہ خدمات شاید ایک مدت دراز تک بے مثال ہی رہیں گی۔ مسجد نبوی تو سلطان ابن سعود مرحوم کے عہد حکومت ہی میں تکمیل کو پہنچ گئی تھی لیکن حرم مکہ کی توسیع و تعمیر کا کام ابھی جاری ہے اور کام کے نقشے کی وسعت و عظمت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی یہ عرصہ تک جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سعودی حکومت کے ان منصوبوں کو تکمیل تک پہنچائے۔

اگرچہ ان گھروں کی رونق و عظمت مرمر کی سلوں اور تعمیری گل کاریوں کی محتاج نہیں ہے لیکن معلوم نہیں کیوں ہر مسلمان کا دل چاہتا یہی ہے کہ حرمین کی عمارتیں ایسی شاندار ہوں کہ کسی عمارت کی شان بھی ان کی شان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کہیں پڑھا ہے کہ وہ حرم کے پاس کوئی مکان حرم سے اونچا نہیں بنانے دیتے تھے' لیکن بعد کے زمانوں میں عین حرم کی دیواروں

سے متصل اہل مکہ نے کرائے پر چلانے کے لیے فلک بوس عمارتیں بنالی تھیں اور ستم یہ ہے کہ ان مکانوں کی کھڑکیاں حرم کی چھتوں پر کھلتی تھیں۔ سعودی حکومت نے ان تمام عمارتوں کا سر غرور اس طرح نیچا کر دیا کہ ان کو تڑوا کر توسیع حرم کی اسکیم میں شامل کر دیا اور خود حرم کی عمارت اتنی شاندار' اتنی خوبصورت' اور اتنی پر عظمت بنوا دی ہے کہ اس کے آگے اب کسی عمارت کے لیے سر اونچا کرنے کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہ گیا۔ میں عام طور پر بہت اونچی عمارتوں کے لیے اپنے دل کے اندر کوئی اچھا تاثر نہیں رکھتا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں حرم کی عمارت کے معاملے میں میرے جذبات بھی یہی ہیں کہ اس کے سامنے کسی عمارت کا سر اونچا نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ سعودی حکومت کو جزائے خیر دے کہ اس نے اس امکان کے تمام راستے بند کر دیے۔

۲۔ دوسری قابل ذکر چیز یہ ہے کہ سعودی عرب میں قانون کا رعب و دبدبہ بہت ہے۔ وہاں چوری' ڈکیتی' رہزنی' قتل' زنا وغیرہ کی وارداتیں یا تو ہوتی ہی نہیں ہیں یا اس قدر کم ہوتی ہیں کہ نہ ہونے کی برابر۔ ملک اپنی آب وہوا کے اعتبار سے اس طرح کے جرائم کے لیے جیسی سازگار فضا رکھتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے اس ملک کی اگلی اور پچھلی تاریخ میں کافی مواد موجود ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ قانون کے دبدبے نے معلوم ہوتا ہے ملک کی آب وہوا کا مزاج ہی بالکل بدل ڈالا ہے۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں حجاج اپنے روپے بے احتیاطی کے ساتھ لیے ہوئے سڑکوں پر یا حرم میں سو جاتے ہیں لیکن چوری اور جیب تراشی کے حوادث سے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔

اس قسم کے حوادث کی اگر ایک دو اطلاعات ہمارے علم میں آئیں بھی تو معلوم ہوا کہ یہ آفاقی حضرات کے کارنامے ہیں' خاص سعودی حکومت کے باشندے ان معاملات میں بڑے محتاط ہو گئے ہیں۔

ہمارے زمانہ قیام میں صرف ایک چور پر قطع ید کی سزا جاری ہوئی۔ اس کا ہاتھ

کلائی کے پاس سے کاٹ کر باب ابراہیم کے سامنے لٹکایا گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے اس بات سے تو بڑی خوشی ہوئی کہ الحمدللہ اس کرۂ ارضی پر ایک حکومت ایسی موجود ہے جو اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا قانون جاری کرتی ہے لیکن ساتھ ہی میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اسلام کے ان قوانین کو جاری کرنے کے لیے ملک کی معاشی اور اخلاقی فضا جیسی کچھ بنانی چاہیے اس کے بنانے کے لیے بھی سعودی حکومت نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہیں یا نہیں؟ یہ سوال اس دوران میں بار بار میرے ذہن میں ابھرتا رہا اور میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب میں نہ پا سکا۔

بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات اس طرح کی سزاؤں کو "وحشیانہ" کہتے ہیں۔ جو لوگ ان سزاؤں کو "وحشیانہ" کہتے ہیں وہ ان تمام وحشیانہ حرکتوں کو بھول جاتے ہیں جن کا ارتکاب ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں ہزاروں کی تعداد میں ہر روز محض اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے ہمارے ہاں کے چور محفوظ ہیں۔ وہاں ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور حاجی حضرات جن کو اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہیں رہتا جہاں چاہتے ہیں اپنی نقدی کے تھیلے اور بٹوے لیے ہوئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔

کیا ہمارے ملک میں بھی اس کا کوئی امکان ہے؟ ہم آئے دن اپنے ملک کے اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ آج فلاں جگہ چوروں نے فلاں گھر پر حملہ کیا اور تمام گھر والوں کو' عورتوں اور بچوں سمیت قتل کر دیا' یا ان کو آگ میں جلا دیا' یا ان کو زہریلی چیزیں کھلا کر بے ہوش کر دیا' یا مردوں کو قتل کر دیا' بچوں کو پیٹا اور عورتوں کی بے عزتی کی۔ یہ ساری چیزیں ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں اور ہمیں وحشیانہ نہیں معلوم ہوتیں لیکن اگر ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے تو ہمیں سزا وحشیانہ معلوم ہوتی ہے۔ سوچنے کا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی کو چوروں' ظالموں' قاتلوں اور خونخواروں سے تو اس حد تک ہمدردی

ہو کہ ان کا ہاتھ کاٹا جانا اسے گوارا نہ ہو لیکن ان کے ہاتھوں ہر روز ہزاروں بے گناہوں کا نہایت وحشیانہ طور پر مشقِ ستم بننا وہ گوارا کرلے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ تعلیم و تہذیب کی کوئی ترقی بھی اس طرح کے حوادث کا سدباب کرسکتی ہے۔ اگر تعلیم و تہذیب کی ترقی ان چیزوں کا سدباب کرسکتی تو امریکہ اور انگلستان میں ان چیزوں کا سدباب ہو جانا چاہیے تھا لیکن آپ اخباروں سے معلوم کرسکتے ہیں کہ جس قسم کی سنگدلانہ چوریاں اور ڈکیتیاں انگلستان اور امریکہ کے مہذب ملکوں میں ہوتی ہیں اس قسم کی سنگدلانہ چوریاں اور ڈکیتیاں ہمارے ملکوں میں نہیں ہوتیں۔

۳۔ تیسری قابل ذکر چیز تعلیم کی توسیع ہے۔ حجاز میں تعلیم کا اوسط بہت کم تھا' لیکن ادھر چند سالوں کے اندر حکومت نے مکاتب و مدارس کے قیام کی طرف بہت توجہ کی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ شہروں اور قصبات سے گزر کر اب دیہاتوں اور بدوی قبائل تک میں مکاتب کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ اور خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ حکومت ان مدارس پر بڑی فیاضی کے ساتھ روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ بعض لوگوں نے تو مجھ سے یہاں تک کہا کہ حجاز میں مکاتب و مدارس کے طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو وظائف حکومت کی طرف سے ملتے ہیں ان کی مقدار اس تنخواہ سے زیادہ ہوتی ہے جو ہمارے ملک میں اساتذہ کو ان کی خدمت تعلیم کے عوض میں ملتی ہے۔ ممکن ہے اس بات میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سعودی حکومت تعلیم پر بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کر رہی ہے۔

۴۔ تعمیری و تمدنی ترقیوں پر بھی حکومت بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ملک میں بڑی تیزی کے ساتھ سڑکیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ تمام قصبات اور دیہاتوں کو سڑکوں کے ذریعے سے شہروں سے ملایا جا رہا ہے۔ اس ملک میں سفر کی مشکلات جیسی کچھ رہی ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے لیکن اب سڑکوں

اور موٹروں کی کثرت اور امن و امان کے قیام نے حالات بالکل بدل دیے ہیں۔

جدہ اور مکہ معظمہ کی عمارتوں کی شان و شوکت دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ نئے دور کے کسی ترقی یافتہ شہر میں اُترے ہیں۔ جدہ اور مکہ معظمہ تو درکنار اب تو منیٰ میں بھی ایسے شاندار ہوٹل بن گئے ہیں جن پر لاہور اور کراچی کے ہوٹلوں کا دھوکا ہوتا ہے۔

شہروں میں پانی اور بجلی کا انتظام بھی اب اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ پانی کی کمی کی تمام پچھلی روایات اب افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔

۵۔ اسلامی تہذیب و معاشرت کے احترام کے پہلو سے بھی سعودی حکومت کا حال قابل تعریف ہے۔ خاص طور پر عورتوں میں پردے کی پابندی بہت شدت کے ساتھ موجود ہے۔ مجال نہیں ہے کہ سعودی عرب کی باشندہ کوئی خاتون آپ کو بے پردہ نظر آجائے۔ اگرچہ اب گھروں کے اندر کی معاشرت بالکل مغربی طرز کی ہوتی جارہی ہے۔ ریڈیو جھونپڑوں کے اندر بھی آپ کو موجود ملے گا۔ لیکن عورتیں جب باہر نکلتی ہیں تو سیاہ برقعوں ہی میں نکلتی ہیں۔ میں نے مکہ معظمہ' مدینہ منورہ یا جدہ' کہیں اس کی خلاف ورزی کی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ سینماؤں' ناچ گھروں' قحبہ خانوں اور شراب خانوں کی ظاہری لعنتوں سے الحمدللہ یہ ملک اب تک پاک ہے۔

بعض قابل توجہ پہلو

ان قابل تعریف باتوں کے پہلو بہ پہلو بعض چیزیں مجھے محتاج اصلاح بھی محسوس ہوئیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اجمالاً ان کا بھی تذکرہ کردوں۔

۱۔ مجھے سب سے زیادہ عرب قومیت کی وہ عصبیت کھٹکتی رہی جس کا صور اس زمانے میں جمال عبدالناصر صاحب نے پھونکا تھا۔ مجھے قومیت کے تصور سے

کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اُس کے اس تعصب سے اختلاف ہے جو مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان بھی دیواریں کھڑی کر دے۔ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان جامع رشتہ اسلامی اخوت کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ دوسرے تمام رشتوں سے زیادہ لائق احترام ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے تھوڑی سی تکلیف ہوئی کہ اب سعودی حکومت بھی بہت سے معاملات کو محدود قومی تصورات کی عینک سے دیکھنے لگی ہے اور ملکی اور غیر ملکی کا فرق یہاں بھی کیا جانے لگا ہے۔ جہاں تک بعض انتظامی نوعیت کی پابندیوں کا تعلق ہے ان کا اختیار کیا جانا تو ناگزیر ہے لیکن اس تصور کا فروغ پانا کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ تمام عربی بولنے والے بلاامتیاز ایمان و عقیدہ ایک الگ قوم ہیں اور دوسرے الگ قوم ہیں۔ مصر اور شام سے اس قسم کے نظریات کا اس زمانے میں جنم لینا کچھ زیادہ عجیب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ زمانہ اس قسم کے فتنوں کے لیے بڑا سازگار ہے لیکن سرزمین پاک --- حجاز --- کے لیے یہی زیبا ہے کہ یہ اس قسم کے جاہلی نعروں سے غیر متاثر ہی رہے۔ حرمین شریفین مسلمانوں کے بین الملی شہر بلکہ بین الملی مرکز ہیں۔ ان میں ازروئے قرآن مقیم اور آفاقی دونوں قسم کے مسلمانوں کے حقوق بحکم سواء ن العاکف فیه والباد بالکل یکساں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح عرب کے رسول ہیں اسی طرح تمام عالم انسانی کے رسول ہیں، خانہ کعبہ جس طرح اہل عرب کا ہے اسی طرح اہل عجم کا بھی ہے۔ اہل عرب اس بات پر شکر تو بے شک کرسکتے ہیں کہ خدا نے عرب ہی کے ایک شہر کو اسلام کا مرکز بنایا لیکن وہ تمام رجحانات جو قومی عصبیت سے پیدا ہوتے ہیں، جاہلیت کے بقایا میں سے ہیں اور انتہائی صدمے کی بات ہو گی اگر وہی لوگ ان کی پرورش کی ذمہ داری لے لیں جنھوں نے سب سے پہلے ان کو دنیا سے مٹانے کی سعادت حاصل کی تھی۔

۲۔ یہ چیز بھی ہمارے زمانہ قیام میں نمایاں طور پر محسوس ہو رہی تھی کہ یہاں

برطانوی اور امریکی سامراج کے خلاف لوگوں کے جذبات اس قدر شدید ہیں کہ حریف یعنی روس کے لیے ان کے اندر ہمدردی پیدا ہو رہی ہے۔ بعض حضرات سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ معاہدہ بغداد کے یہ لوگ بڑے خلاف ہیں اور روس کو یہ لوگ اہون البلیتین خیال کرتے ہیں۔ میں نے ایک بزرگ سے ایک روز باتوں باتوں میں کہا کہ امریکہ اور برطانیہ سے بیزاری کے معاملے میں تو میں آپ لوگوں کو حق بجانب سمجھتا ہوں لیکن اس بیزاری کے لیے یہ تو لازم نہیں ہے کہ آپ کو روس سے ہمدردی ہو جائے؟ ان کے جواب سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس کا تجربہ نہیں کیا ہے امید یہی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ بہتر ہی ہو گا۔ میں نے کہا یہ خیال تو کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ لوگوں پر کالفار من الرمضاء الی النار والی مثل صادق آئے۔ یعنی ریت سے بھاگے، آگ میں کودے۔

میری جن حضرات سے گفتگوئیں ہوئیں، ان کی گفتگوؤں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کے لوگوں کی سیاسی رائیں عموماً معلومات اور دلائل سے زیادہ جذبات پر مبنی ہیں۔ اسی وجہ سے میرا گمان یہ ہے کہ اب ان رجحانات میں بہت بڑی حد تک تبدیلی واقع ہو گئی ہو گی کیونکہ عراق کے حوادث نے کیونزم کا ایک ہلکا سا تجربہ اہل عرب کو کرا دیا ہے۔

۳۔ میں نے یہ چیز بھی محسوس کی کہ حجاز کے شہروں میں مصر و شام کے داعیٔ الحاد رسائل و اخبارات کی بڑی کھپت ہے۔ میں نے مصور وغیرہ جیسے رسائل بکثرت یہاں بکتے دیکھے۔ ان رسائل و اخبارات میں زیادہ تر عربی قومیت کے ابھارنے والے اور الحاد واباحیت کی دعوت دینے والے مضامین ہوتے ہیں۔ فحش جنسی مضامین اور نیم عریاں تصاویر مزید برآں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کا نوجوان طبقہ ان رسائل کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا ہے۔ میں نے بعض نوجوانوں کو یہ رسائل جیبوں میں اُڑسے ہوئے حرم میں پھرتے دیکھا۔

ان چیزوں کو اس زمانے میں قانون کے ذریعے سے روکنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جن نوجوانوں کے ہاتھوں میں یہ زہر پہنچ رہا ہے ان کے لیے اگر کچھ لوگ تریاق بہم پہنچائیں تو وہ بھی ان تک پہنچنے دیا جائے لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ رسالے تو ہر جگہ دھڑلے سے بکتے ہیں لیکن اگر کچھ لوگ ان نوجوانوں کو اس طرح کی چیزیں پہنچانے یا پڑھانے کی کوشش کریں جس قسم کی چیزیں جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے لوگوں نے شائع کی ہیں تو مجھے معلوم ہوا ہے کہ سعودی حکومت اس کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک یہ صورت حال نہایت تشویش انگیز ہے۔ یہ ہر مسلمان حکومت کی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ایمان و اخلاق کی حفاظت کرے۔ سعودی حکومت کا اول فرض تو یہ ہے کہ اس قسم کی فتنہ انگیز چیزوں سے اپنے نوجوانوں کو بچائے لیکن اگر وہ کسی مصلحت سے نوجوانوں کی اس آزادی میں خلل انداز ہونا پسند نہیں کرتی تو پھر اس کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے برے اثرات کے تدارک کی بھی فکر کرے اور ان کے لیے صالح فکری غذا کا بھی سامان کرے۔ یہ مسئلہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ حجاز ہمارا روحانی مرکز ہے۔ اس کا بناؤ اور بگاڑ سب پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۴۔ سعودی حکومت خدا کے فضل سے اب تیل کی رائلٹی کی بدولت ایک صاحب وسائل و ذرائع حکومت ہے۔ اب اگر یہ اپنی دولت صحیح تقسیم کے ساتھ ملک اور اہل ملک کی بہبود و ترقی پر خرچ کرے تو بڑی جلدی اس ملک کے ہر شعبہ زندگی میں ترقی و رفاہیت کے آثار نظر آنے لگیں۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ابھی ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ شاہی خاندان کے افراد کی ذاتی دلچسپیوں اور ان کی بیرونی سیروں اور سیاحتوں پر خرچ ہوتا ہے۔ شاید اسی چیز کا یہ نتیجہ ہے کہ یہاں کی ساری رفاہیت بس ایک نہایت ہی محدود طبقے کے اندر سمٹی

ہوئی نظر آتی ہے۔ عام ملک اسی طرح غریب اور تنگ حال ہے جس طرح کبھی پہلے رہا ہوگا۔ شہروں میں تمدنی سامانوں کی وہ کثرت اور وہ چمک دمک ہے کہ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن ان چیزوں تک پہنچ بہت تھوڑے لوگوں کی ہے۔ زیادہ تر صرف ان لوگوں کی جو کسی نہ کسی نوعیت سے حکومت کے متوسلین میں ہیں۔ عام لوگ ابھی پیٹ کی روٹی کے مسئلہ سے زیادہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں اور روٹی حجاز میں ناقابل برداشت حد تک گراں ہے۔

پچھلے دنوں جلالۃ الملک اور امیر فیصل کے درمیان اختلاف رائے کی خبروں نے اخبارات میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ اس اختلاف رائے کا زیادہ تر تعلق ملکی خزانے کے اسی بیجا اسراف سے ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے ارباب حل و عقد اس صورت حال سے بے خبر نہیں ہیں۔ جلالۃ الملک کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ بڑے نرم مزاج بادشاہ ہیں۔ نرم مزاج لوگوں میں جہاں یہ عیب ہوتا ہے کہ ان کی نرم مزاجی سے ذی اثر متعلقین غلط فائدے اٹھا لیتے ہیں وہیں ان میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ وہ صحیح مشوروں کی قدر بھی کرتے ہیں۔ ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ اس ملک کی خداداد دولت افراد کی دلچسپیوں کے بجائے ملک کی ترقی اور بہبود پر خرچ ہو اور یہ ملک تمام مسلمان ملکوں کے لیے ایک اچھا نمونہ ہو۔

۵۔ حکومت کی توسیع تعلیم کی اسکیم کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اس کا یہ پہلو تو بڑا خوش آیند ہے کہ اس سے عوام کی جہالت دور ہو گی۔ لیکن ساتھ ہی اس کا ایک پہلو تشویش انگیز بھی میرے علم میں آیا ہے وہ یہ کہ یہ تعلیم زیادہ تر مصری اساتذہ کے ہاتھ میں ہے اور ان اساتذہ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ بیشتر ملحد یا کم از کم دین سے بالکل بے پروا ہیں۔ مصری اخبارات کے ذوق و رجحان کا اندازہ اسی ایک امر سے کیجیے کہ سعودی حکومت کے محکمہ حفظان صحت کے

ڈائریکٹر مصری ہیں اور ان کا نام نامی حجاز ہی کے کسی اخبار میں میں نے فرعون رشاد پڑھا تھا۔ تعلیم بڑی اعلیٰ چیز ہے لیکن غلط آدمیوں کے ذریعہ سے جو تعلیم دی جاتی ہی وہ مفید کم اور مضر زیادہ ہوتی ہے۔ جس سرزمین سے ساری دنیا کو ایمان و سلام کی دولت نصیب ہوئی ہے' یہ کتنا بڑا حادثہ ہو گا اگر وہیں سے الحاد تقسیم ہونے لگے۔ ہر ملک کے ذمہ داروں پر اس ملک کے باشندوں کے دین و ایمان کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر سعودی حکمت اپنی اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئی تو اس کی تلافی حرمین کی توسیع کی اسکیم سے ہرگز نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ یہ اسکیم کتنی ہی شاندار ہو۔

۶۔ آزادی رائے کی نعمت سے اس وقت جس طرح تمام مشرق وسطی محروم ہے اسی طرح حجاز بھی اس نعمت سے محروم ہے۔ یہاں کے اخبارات جہاں تک ظاہری ٹیپ ٹاپ کا تعلق ہے' اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن اظہار رائے کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس اعتبار سے سرکاری' نیم سرکاری اور پبلک سارے ہی اخبارات کا مزاج بالکل ایک ہے۔ ان میں زیادہ تر شاہی احکام و فرامین اور سرکاری حکام کے دوروں کی تفصیلات چھپتی ہیں یا پھر درخواستیں اور عرض داشتیں۔ دینی رسائل کا معیار بھی کچھ اونچا نہیں ہے حالانکہ دل یہ چاہتا ہے کہ دین کی حجت قائم کرنے والے سب سے زیادہ بلند پایہ رسائل یہیں سے نکلیں۔ یہاں کے علما کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ حضرات زیادہ تر سرکار سے وظیفے پاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے اس توقع کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ حکمرانوں کو صحیح مشورے دینے کی جرات کر سکیں گے۔ بعض علما کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ حق نصیحت میں جری ہیں اور وہ نتائج سے بے پروا ہو کر اپنا یہ فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور ملک میں ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔

۷۔ یہاں میں نے کسی بڑے دینی و علمی ادارے کی بھی کمی محسوس کی حالانکہ مرکز اسلام ہونے کی وجہ سے سب سے بڑا دینی و علمی مرکز اسی سرزمین پر ہونا چاہیے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جو مدرسے قائم ہیں وہ بالکل عام قسم کے ہیں۔ ریاض میں کسی بڑے علمی مرکز کے قیام کی اسکیم کی خبر سنی تھی اور اس کے لیے عبدالوہاب عزام مرحوم مصر سے بلائے بھی گئے تھے لیکن معلوم نہیں اب وہ کس مرحلے میں ہے۔ اس وقت اسلام جس نازک دور سے گزر رہا ہے اس کے تقاضوں سے سعودی حکومت بے خبر نہیں ہو سکتی۔ آج جس قسم کے رجال اسلام کی ترجمانی کر سکتے ہیں اس قسم کے رجال پیدا کرنے کا کہیں بھی انتظام نہیں ہے' حد یہ ہے کہ وہاں بھی نہیں ہے جہاں سے ساری دنیا کو اسلام کی روشنی ملی تھی۔ سعودی حکومت اگر اس قسم کا کوئی مرکز قائم کرے تو وہ وقت کی سب سے بڑی دینی ضرورت پوری کرے گی۔ یہ کام اس کے کرنے کا بھی ہے اور اس کے لیے اس کے پاس وسائل و ذرائع بھی ہیں۔

امام ابن تیمیہ' امام ابن قیم اور شیخ عبدالوہاب کی بعض کتابیں شائع کر کے سعودی حکومت نے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے لیکن ضرورت ہے کہ شیخین کی تمام کتابیں نہایت اعلیٰ اہتمام سے چھاپ کر شائع کی جائیں اور سستے داموں فروخت کی جائیں۔ علاوہ ازیں دوسرے آئمہ اور علما کی وہ کتابیں بھی چھاپی اور شائع کی جائیں جو دین کی حجت قائم کرنے والی ہیں۔ اس عہد زوال و انحطاط میں تو اسلام نہ صرف رجال دین سے بلکہ قدیم دینی کتابوں سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے۔ اگر سعودی حکومت یہ خدمت انجام دے تو حجاج کے واسطے سے یہ کتابیں تمام اسلامی دنیا کے خادمان دین کو نصیب ہو سکتی ہیں اور کتابوں کے اس قحط کے زمانے میں یہ خدمت کوئی معمولی خدمت نہیں ہو گی۔

۸۔ حجاج اور حرم سے متعلق جو امور قابل توجہ ہیں ان کی طرف میں مناسب مواقع پر اشارہ کرتا آیا ہوں البتہ ایک بات رہ گئی ہے اس کی طرف یہاں توجہ دلاتا

چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ حرم میں خواتین کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہو گا کہ خواتین ہی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ حرم کے حبشی خدام ہی عورتوں اور مردوں دونوں کی چرواہی کرتے ہیں۔ ان کا رویہ عام طور پر تو اچھا ہوتا ہے لیکن بسا اوقات وہ ایسا رویہ اختیار کرنے پر شاید مجبور ہو جاتے ہیں جو کم از کم عورتوں کے حد تک شریعت کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہوتا ہے۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہ ہے کہ حرم میں جس طرح مرد خدام مقرر کیے گئے ہیں اسی طرح کچھ خاتون خادمات بھی مقرر کی جائیں اور اگر ان کے مستقل طور پر مقرر کیے جانے میں کوئی زحمت ہو تو کم از کم زمانہ حج کے لیے کچھ خواتین کی خدمات رضاکارانہ طور پر حاصل کی جائیں، اور مسجد نبوی اور بیت اللہ میں جہاں تک عورتوں کی نگرانی، ان کی روک ٹوک اور ان کو پانی پلانے کا معاملہ ہے اس طرح کے سارے کام ان کے سپرد کیے جائیں۔ ان رضاکار خواتین کے لیے حرم کی انتظامیہ کی طرف سے کوئی ایسا نشان مقرر کر دیا جائے جس سے ان کی ذمہ دارانہ حیثیت نمایاں ہو سکے۔

اسی طرح اگر خواتین کے طواف کے لیے کچھ اوقات مخصوص کر دیے جائیں تو غالباً شرعی نقطہ نظر سے یہ بات کچھ قابل اعتراض نہ ہو گی اور اس سے دوسرے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان باتوں کے ذکر کرنے سے ہمارا مقصود سعودی حکومت کی تنقیص نہیں ہے۔ ہمارے دل میں جس طرح اپنی حکومت کے لیے عزت و احترام ہے اسی طرح سعودی حکومت کی لیے بھی عزت و احترام ہے۔ ان باتوں کی طرف ہم نے صرف خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور مقصود یہ ہے کہ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات مفید اور قابل قبول ہو تو وہ سامنے آ جائے اور ارباب حل و عقد اس کو لائق توجہ سمجھیں تو اس پر غور کر سکیں۔

واپسی

حج کے بعد کی ایک ماہ کی مدت معلوم ہوا کہ پلک جھپکتے گزر گئی۔ جب وطن کو واپسی کے دن قریب آ گئے تو دل کے اندر ایک عجیب کشمکش سی شروع ہو گئی۔ جب یہ خیال آئے کہ اب ہم فلاں روز وطن کے لیے روانہ ہو جائیں گے تو اس خیال سے ایک بڑی گہری خوشی ہو، لیکن ساتھ ہی جب یہ خیال آئے کہ اب ہم حرم سے جدا ہو جائیں گے اور معلوم نہیں زندگی میں اس گھر کی زیارت پھر کبھی حاصل ہو گی یا نہیں تو اس تصور سے ایک ناقابل بیان صدمہ بھی ہو۔ دیر و حرم کی اس کشمکش سے ہر ایک کو سابقہ پیش آتا ہو گا، یہ تجربہ کچھ میرے ہی لیے خاص نہیں تھا، لیکن آخری دنوں میں میرے اندر یہ کشمکش اتنی سخت ہو گئی کہ اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

اس دوران میں اس سوال پر میں نے بار بار غور کیا کہ بیت اللہ کے ساتھ یہ تعلق محض جذباتی ہی ہے یا اس میں کچھ دخل عقل کو بھی ہے۔ میرے دل نے اس سوال کا ایک ہی جواب ہر بار دیا کہ اس گھر پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک خاص پرتو ہے جس کا عکس ہر اس شخص کے دل پر پڑتا ہے جو اس گھر میں ایمان و اسلام کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔

مکہ معظمہ سے روانگی

روانگی کے لیے ہم نے یہ سوچا کہ لاری سے سفر کرنے کے بجائے ہم کوئی اسٹیشن ویگن کرایہ پر کر لیں۔ یہ ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ لاریاں اپنی سواریوں کی متعین تعداد پوری کرنے کے لیے بسا اوقات کئی کئی گھنٹے معلموں کے ڈیروں کا طواف کرتی رہتی ہیں جس سے آدمی مکہ معظمہ کی گرمی اور دھوپ میں بڑا خراب ہوتا ہے لیکن یہاں قاعدہ یہ ہے کہ کوئی حاجی لاریوں سے سفر کرے یا نہ کرے اسے لاریوں کا کرایہ ضرور بھرنا

پڑتا ہے۔ اس کے لیے شکل یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے اس کرائے کے حق استعمال سے جو پہلے ہی جمع کرا لیا جاتا ہے' دستبرداری لکھنی پڑتی ہے۔ ہم نے مذکورہ بالا زحمت کے پیش نظر نقصان گوارا کیا اور کرائے کے حق استعمال سے دستبرداری لکھ دی۔

روانگی کا دن

روانگی کے دن متعینہ وقت پر گاڑی ہمارے دروازے پر آ گئی اور اپنی روایت کے مطابق ہمارے معلم سید عقیل عطاس صاحب بھی ٹھیک وقت پر اپنے آدمیوں کے ساتھ آ پہنچے.... اور نیچے ایک دکاندار کے تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کے آدمیوں نے ہمارا سارا سامان اوپر سے نیچے اتارا اور قرینے سے گاڑی میں رکھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم کو آخری طواف کرنا اور اس بابرکت شہر سے جدا ہونا تھا۔

آخری طواف

میں نے جب آخری طواف کے لیے حرم کا رخ کیا تو اس وقت میرے دل پر وطن کو روانگی کی خوشی سے زیادہ حرم سے جدائی کے صدمہ کا احساس تھا۔ جس چیز پر میری نگاہ پڑتی تھی اس پر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی تھی کہ اب اس مقدس شہر کی اس چیز کو پھر بھی دیکھنا نصیب ہو گا یا نہیں۔ میں حرم میں داخل ہوا تو مجھے ہر چیز پر ایک عجیب اداسی سی معلوم ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے اپنے دل کی حالت کا ایک عکس تھا جو مجھے ہر چیز پر نظر آ رہا تھا ورنہ حرم کی رونقوں میں بھلا کہاں فرق آتا ہے۔ میں نے طواف کیا' حطیم میں اور مقام ابراہیم میں نفلیں پڑھیں' حرم کے مختلف گوشوں پر وداعی نگاہیں ڈالی لیکن اس دوران میں برابر میں کھویا کھویا سا رہا۔ مطاف کے پلیٹ فارم سے بالکل متصل ایک حبشی خاتون بیٹھا کرتی تھیں جن کے پاس بعض لوگ اپنے جوتے طواف کے وقت حفاظت کے لیے رکھ دیا کرتے تھے۔ میں بھی بالعموم اپنے جوتے اُنھی کے پاس چھوڑتا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت ان کی خدمت میں کچھ نذر پیش کی' اور ساتھ ہی یہ فقرہ میری زبان سے نکلا کہ "ماں جی! اب ہم تو چلے' دعا کرو کہ خدا پھر یہ گھر دکھائے۔" انھوں نے میرے

لیے دعا کی۔ اس وقت میرا دل بھر آیا۔ میں نے مڑ کر بیت ا پر آخری نظر ڈالی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی زندگی کا آخری ورق الٹ رہا ہوں ب ابراہیم کی سیڑھیوں کے پاس میں آ کے کھڑا ہو گیا۔ میرا دل صدمے سے پارہ پارہ ہو تھا۔ میں وہاں بڑی دیر تک کھڑا رہا اور وہاں سے بیت اللہ کا جتنا حصہ نظر آ رہا تھا اس کو دیکھتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گھر کو کتنا محبوب بنایا ہے۔ باب ابراہیم کی دہلیز سے جدا ہوتے ہوئے میرے دل پر جو کچھ گزری بعض عرب شاعروں نے اپنے شعروں میں اس کی بڑی سچی تصویر کھینچی ہے لیکن وہ اور کوچے کی باتیں ہیں اور یہ ایک دوسرے ہی عالم کی باتیں ہیں اس وجہ سے دل نہیں چاہتا کہ ان واردات کے بیان کے لیے ان شاعروں کے الفاظ مستعار لوں۔

جدہ کو روانگی

کچھ دیر کے بعد آخری فرائض سے فارغ ہو کر سارے رفقا جمع ہو گئے اور ہم جدہ روانہ ہونے کے لیے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ معلم صاحب اور ان کے آدمیوں نے ہمیں رخصت کیا اور ہم نے ان کی خدمات اور ان کے اخلاص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو رخصت کیا۔ عام طور پر جو لوگ حج سے واپس لوٹتے ہیں وہ اپنے معلموں سے شاکی لوٹتے ہیں۔ الحمدللہ ہمیں اپنے معلم صاحب سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ تھی کہ معلم صاحب نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی وہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے معلم صاحب کو کبھی کسی ایسے کام کی زحمت نہیں دی جس سے ہم خود عہدہ برآ ہو سکتے ہوں۔ ہم نے سفر کو برابر سفر سمجھا۔ گھر کی راحتیں حاصل کرنے کی کبھی تمنا نہیں کی۔

جس وقت ہماری گاڑی روانہ ہوئی اور صفا کی پہاڑی کے چکر کے پاس سے ہم نے بیت اللہ پر آخری نظر ڈالی ہے تو دل کی جو حالت ہوئی ہے وہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ حرم کو آخری بار دیکھ لو اور دعا کرو کہ خدا یہ گھر پھر دکھائے۔

ہمارا یہ سفر سخت دھوپ کے وقت ہوا لیکن دل کچھ اس طرح کھویا کھویا سا رہا کہ نہ

سردی کا احساس تھا نہ گرمی کا۔ اس دوران میں ہم صرف ایک مرتبہ ذرا سا بیدار ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری گاڑی اس نشان کو عبور کرنے لگی ہے جو حدود حرم پر بطور ایک نشان فاصل کے لگا ہوا ہے۔ یہاں دل نے ایک مرتبہ اور جدائی کی بڑی سخت کسک محسوس کی۔ اس نشان کو پار کرتے ہی ہم پھر اسی دنیا میں آ گئے جس دنیا سے نکل کر اس پاک علاقہ میں گئے تھے۔

مدینۃ الحجاج میں

جب ہم جدہ کے مدینۃ الحجاج میں پہنچے تو یہ دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی کہ یہاں سخت ازدحام ہے۔ نہ صرف یہ کہ تمام کمرے بھرے ہوئے تھے بلکہ بہت سے حاجی کپڑے تان تان کر مدینۃ الحجاج کے صحن ہی میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن جوں ہی ہم پہنچے غالباً مصر کے کچھ حاجیوں نے ایک کمرے کا ایک گوشہ خالی کیا۔ ہم بغیر کسی مزاحمت کے ان کی جگہ پر قابض ہو گئے۔ اگرچہ اس کمرے میں بمبئی کے علاقے کے کچھ ایسے حاجی ٹھہرے ہوئے تھے جن کی خواتین کا لباس بالکل غیر شرعی تھا' جس سے طبیعت کو برابر ایک تکدر سا رہا' لیکن اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے رہے کہ ہم مدینۃ الحجاج کے صحن میں ڈیرے ڈالنے کی مصیبت سے محفوظ رہے۔

ملاقاتیں

جدہ سے مجھے برابر کچھ مخلصین کے پیغامات ملتے رہے تھے کہ وہ مجھ سے ملنا اور بعض مسائل پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہلا رکھا تھا کہ واپسی کے وقت ان شاء اللہ ملاقات کا وقت نکالوں گا۔ جدہ میں ہمیں پورا دن صرف ایک ہی گزارنے کا موقع ملا۔ اس وجہ سے ان مخلصین کو اطلاع دینا تو میرے لیے مشکل تھا لیکن ہمارے معلم کے وکیل کے ذریعے سے جو لوگ ہماری واپسی کا پروگرام معلوم کر سکے تھے وہ مختلف اوقات میں مل لیے۔ یہاں کے اکثر مخلصین جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے وجوہ معلوم کرنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے ان میں سے بعض کو ٹالنے کی کوشش کی اور

بعض کو ان کے سوالوں کے مناسب جواب دے دیے۔ یہاں کی بعض ملاقاتوں کا مختصر طور پر میں ذکر کروں گا۔

سید عبداللہ عباس صاحب ندوی

یہ جدہ ریڈیو میں ملازم ہیں۔ یہ بڑے اخلاص سے ملے۔ انھوں نے جدہ ریڈیو سے نشر کرنے کے لیے مجھ سے ایک انٹرویو لینے کی خواہش کی۔ میں نے ان سے معذرت کر دی کہ سفر کی اس رواروی اور اس بے اطمینانی میں یہ خدمت انجام دینا میرے لیے مشکل ہے۔ میری اس معذرت کی دو وجہیں تھیں۔ اول تو مجھے یہ لیڈرانہ قسم کی حرکت کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی' ثانیاً میں نے محسوس کیا کہ جس قسم کا پیغام میں دے سکتا ہوں وہ انھیں شاید پسند نہ آئے اور جو انھیں پسند آئے گا ممکن ہے اس پر میرا دل مطمئن نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ معذرت کر لوں۔

میری اس معذرت کے بعد انھوں نے دو قسم کے سوال نامے مرتب کر کے مجھے پکڑائے۔ ایک میں جماعت اسلامی سے علیحدگی کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی' دوسرے میں سعودی حکومت اور اس کی خدمات سے متعلق میرے تاثرات دریافت کیے گئے تھے۔ میں نے یہ سوال نامے اپنے پاس رکھ لیے اور ان سے وعدہ کیا کہ خدا نے چاہا تو جہاز میں ان کے جوابات نوٹ کر کے کراچی سے پوسٹ کر دوں گا۔ جس وقت میں نے وعدہ کیا تھا اس وقت میرا خیال یہی تھا کہ میں ان سوالوں کے جواب ضرور دوں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں یہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔ جہاں تک جماعت اسلامی سے متعلق سوالات کا تعلق تھا ان کا تو جواب دینے کو جی ہی نہیں چاہا۔ البتہ سعودی حکومت سے متعلق میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن جہاز میں سوار ہوتے ہی اس سفرنامہ کا خیال' جو اب تک کچھ مذبذب سا تھا' پختہ ہو گیا۔ اس خیال کے پختہ ہو جانے کے بعد مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ جو کچھ لکھنا ہے' اس سفرنامے ہی میں لکھوں گا۔ اب اس سفرنامے نے اس خلاف وعدگی کی تلافی اگرچہ ایک حد تک کر دی ہے لیکن مجھے مولانا سید

عبداللہ عباس صاحب سے شرمندگی ضرور ہے کہ میں ان کی ایک مخلصانہ خواہش وعدہ کرنے کے باوجود پوری نہ کر سکا۔ امید ہے مولانا میری اس غلطی کو معاف فرمائیں گے۔

خطاط زادہ عبدالملک سلمہ

یہاں اپنے ایک پرانے شاگرد عزیزی عبدالملک سلمہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ جس زمانے میں میں اخبار مدینہ (بجنور) میں ملازم تھا اس زمانے میں انہوں نے عربی کے کچھ ابتدائی سبق مجھ سے لیے ہیں۔ یہ مراد آباد کے مشہور کاتب عبدالقیوم خاں خطاط کے (جنھوں نے مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کی کتابت کی ہے) صاحبزادے ہیں۔ خاں صاحب سے میرے محبانہ روابط تھے۔ اس تعلق سے یہ میرے پاس آجاتے اور میں ان کو کچھ بتا دیا کرتا۔ میرا پڑھانا وڑھانا تو خیر کیا رہا ہو گا' بچوں کو پڑھانے سے مجھے زیادہ مناسبت کبھی نہیں رہی ہے' لیکن ان عزیز نے میرے ہی پڑھانے کی بڑی قدر کی۔ انھوں نے میرے بعد بہت کچھ پڑھا اور شاید بہت کچھ پڑھایا بھی ہو گا لیکن یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ میری حقیر خدمت کا اعتراف برابر کرتے رہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "پیر مراخس است اعتقاد مرابس است" اس ناچیز کے ساتھ ان کا معاملہ اسی ضرب المثل کے مطابق ہے۔

یہ ایک عرصے سے تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اب کچھ مدت سے عرب قبائل میں تبلیغ دین کے ارادے سے مدینہ منورہ میں جا بیٹھے ہیں۔ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا' تو یہ کسی تبلیغی دورے پر نکلے ہوئے تھے اس وجہ سے مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ جدہ میں آکر ملاقات ہوئی اور اس ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی نیکی اور سعادت مندی سے تو میں ان کے بچپنے سے واقف تھا لیکن اس ملاقات سے اندازہ ہوا کہ اب طبیعت پر شوق تبلیغ کا اس قدر غلبہ ہے کہ اس شوق کے آگے زن و فرزند اور عیال و خانماں سب سے بے نیاز و بے پروا ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ یہاں معاش کے لیے کیا کرتے ہو؟ انھوں نے سوال کا ایسا قلندرانہ جواب دیا کہ مجھے اپنے

اس دنیادارانہ سوال پر تھوڑی سی شرمندگی ہوئی ——— یہ عزیز جدہ کے چند گھنٹوں کے قیام میں کئی بار ملنے آئے اور جب آئے تو کوئی نہ کوئی تحفہ بھی لے کے آئے۔ یہ جہاں رہیں میری دعا ہے کہ خوش رہیں اور اللہ کے دین کی کوئی خدمت کرتے رہیں۔

سعید رمضان صاحب

یہاں سعید رمضان صاحب سے ملاقات کی توقع پہلے سے تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن کلیب نے اطلاع دی کہ وہ فندق قصر قریش میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ جس شام کو ان سے ملاقات کے لیے جانا تھا اس شام کو میرے پاس بہت سے مخلصین جمع ہو گئے اور ان سے باتیں کرنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ سعید رمضان صاحب کے پاس جانے کے لیے موزوں وقت باقی نہیں رہ گیا۔ میں نے ان کو فون کرایا کہ اب ملاقات کے لیے موزوں وقت باقی نہیں رہا ہے اس لیے وداعی سلام عرض کرتا ہوں اور حاضر نہ ہو سکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہلایا کہ 'نہیں' میں شب کے ۳ بجے تک (حجاز کے وقت سے جہاں مغرب کے وقت ۱۲ بجتے ہیں) انتظار کروں گا' ضرور آؤ۔

تھوڑی دیر میں عبداللہ بن کلیب گاڑی لے کر آگئے اور میں ان سے ملنے کے لیے فندق قصر قریش پہنچا۔ یہ ہوٹل بڑا شاندار ہے۔ مجھے تو بالکل ہمارے لاہور کے فلیٹی کی طرح معلوم ہوا۔ اسی ہوٹل میں کامل شریف صاحب سیکرٹری موتمر اسلامی اور بعض دوسرے لیڈر اور اخبار نویس حضرات ٹھہرے ہوئے تھے۔ سعید رمضان صاحب نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ میں سعید رمضان صاحب کے پاس ان سے باتیں کرنے کے لیے بیٹھ گیا اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کامل شریف صاحب سے انٹرویو لینے میں مصروف ہو گئے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ ہم مختلف مسائل پر باتیں کرتے رہے۔ عراق کے حوادث ابھی بالکل تازہ تھے اس وجہ سے قدرتی طور پر گفتگو کا موضوع زیادہ تر وہی رہا۔ رخصت ہوتے وقت جب سعید رمضان صاحب زینے سے نیچے مجھے چھوڑنے آئے اور میں نے ان سے رخصتی مصافحہ کیا ہے تو میرا دل بھر آیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی

بہت متاثر ہیں۔

بندرگاہ پر

صبح کو ہمیں سردھانا سے وطن کے لیے روانہ ہونا تھا اس وجہ سے میں نے تمام مخلصین سے کہلا دیا کہ چونکہ میں سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوں گا اس وجہ سے کوئی صاحب ملاقات کے لیے زحمت نہ اٹھائیں۔ صبح ہم نے اپنا سامان تیار کیا اور جہاز کے قلیوں کی ایک پارٹی نے آ کر ہمارے سارے سامان پر اپنا ایک خاص نشان لگا دیا۔ مسافرخانے سے جہاز تک ہم سرکاری لاریوں سے بھی جا سکتے تھے لیکن ہم نے انتظار اور کشمکش سے بچنے کے لیے یہ پسند کیا کہ ایک ٹیکسی کر لیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ایک ٹیکسی آئی اور ڈرائیور نے اس میں ہمارا سامان بھرنا شروع کیا۔ ہم پانچ آدمی تھے اور ہم سب کا سامان مل ملا کر اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ گاڑی بالکل چھوٹے ماڈل کی تھی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ گاڑی ایک ہی مرتبہ میں ہم کو اور ہمارے سارے سامان کو لے جا سکے گی لیکن ڈرائیور کی اسکیم یہی تھی کہ ہمارے پورے قافلے اور ہمارے سامان کو وہ ایک ہی پھیرے میں پہنچائے گا۔ چنانچہ وہ ہنس ہنس کر ہمارا سامان گاڑی کے اوپر اور نیچے بھرتا رہا اور حکیم صاحب کھڑے احتجاج کرتے رہے۔ بالآخر اس نے سارا سامان بھر لینے کے بعد ہمیں بھی دعوت دی کہ آؤ اس میں گھسو۔ ہمیں اس میں کوئی گھسنے کی جگہ تو نظر آتی نہیں تھی لیکن اس نے نہ صرف ہم ہی پانچ آدمیوں کو اس میں بھر لیا بلکہ ہمارے قلیوں کی پارٹی کے ایک نمائندے کو بھی اس نے اسی میں گھسا لیا۔ میں اس گاڑی کے جہاز تک پہنچنے سے بالکل مایوس تھا لیکن ڈرائیور برابر ہنستا اور باتیں کرتا رہا اور میں نے پانچ منٹ میں دیکھا کہ گاڑی ہمارے جہاز سردھانا کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑی ہے۔

سردھانا جہاز کے عرشے پر

سردھانا جہاز وہی جہاز ہے جس سے ہم ایک روز جدہ کے ساحل پر اترے تھے۔ اس یار آشنا کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم جس وقت پہنچے ہیں سوار ہونے والوں کی ایک لمبی

قطار سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے کشمکش کر رہی تھی اور لوگوں کے سامان کرینوں سے اٹھا اٹھا کر جہاز کے عرشے پر پھینکے جا رہے تھے۔ میرے ساتھی تو کسی نہ کسی طرح جہاز پر پہنچ گئے لیکن میں کشمکش سے بچنے کے لیے جہاز کے پھیلے ہوئے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ اسی دوران میں کسٹم والوں کا ایک سپاہی آیا اور اس نے ہمارے سامان کے چند گتے کے ڈبوں کے کھولنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے اس مطالبے نے سخت الجھن پیدا کر دی۔ ہم نے کیا یہ تھا کہ ہمیں شعبہ امر بالمعروف وغیرہ کی طرف سے کچھ کتابیں جو تحفہ میں ملی تھیں یا جو کتابیں ہم نے خریدی تھیں وہ ساری کتابیں بازار سے ولایتی مالوں کے خالی ڈبے خرید کے ان میں بھر لی تھیں اور ان کو اچھی طرح رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ کسٹم والے کا کہنا یہ تھا کہ ان ڈبوں پر جن چیزوں کے لیبل لگے ہوئے ہیں ان کے اندر سامان بھی وہی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے' ان میں کتابیں ہیں جو ہم نے یہیں سے خریدی ہیں۔ اس نے کہا انھیں کھولنا ہو گا۔ میں نے کہا یہ ناممکن ہے۔ میرے اور اس کے درمیان یہ ردوبدل ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں ایک صاحب انگریزی سوٹ میں نمودار ہوئے۔ وہ بڑے تپاک سے سلام و مصافحہ کر کے مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ پھر ایک تحکمانہ انداز سے انہوں نے کسٹم والے سے کوئی بات کہی جس کے سنتے ہی وہ وہاں سے چل دیا۔ اس کے بعد انھوں نے میرا سارا سامان اپنے سامنے کرینوں میں بھروا کے اوپر بھجوا دیا۔ یہ فرشتہ رحمت ایک پاکستانی تھے جو سعودی حکومت میں کوئی عہدہ دار ہیں۔ یہ مجھ سے ملنے کے شوق میں وہاں بالکل وقت کے وقت پہنچے تھے۔ میں ان سے باتیں تو صرف چند ہی منٹ کر سکا لیکن ان کے اس احسان اور اس عزت بخشی کی یاد عرصے تک میرے دل میں باقی رہے گی۔

سامان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے جہاز کی سیڑھیوں پر قدم رکھنا چاہا تو ایک نوجوان جو حاجیوں کو سوار کرانے کے سلسلے میں کچھ رضاکارانہ خدمات انجام دے رہے تھے' ہنس کے بولے کہ میں ابھی آپ کو جہاز پر جانے نہیں دوں گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ آپ درجہ اول کے مسافر ہیں' آپ کا کیبن تو محفوظ

ہے' اس پر کون قبضہ کر سکتا ہے؟ میں ان کی اس مخلصانہ فہمائش کے بعد اپنی جگہ پر آ کے کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہلا جب تک انہوں نے بڑے پیار سے مجھے یہ دعوت نہیں دی کہ "اب آ جایئے' اب راستہ صاف ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے زینہ پر قدم رکھا' ان سے مصافحہ کیا اور جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا۔

کیبن میں

میں جب جہاز پر اپنے کیبن میں پہنچا ہوں' مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سفر ختم ہو گیا اور ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔ اسی کمرے میں ہم اس سے پہلے چھ سات راتیں نہایت آرام وسکون کی گزار چکے تھے اس وجہ سے اس کی ایک ایک چیز سے ہم آشنا اور مانوس تھے۔ ہم نے پہلے تو قرینے سے اپنا سامان مرتب کیا اس کے بعد ساحل جدہ کو رخصت کرنے کے لیے عرشے پر کھڑے ہو گئے۔ اسی دوران میں ہمارے حج آفیسر تشریف لائے۔ حکیم صاحب نے ان سے تعارف کرایا۔ کھڑے کھڑے دو دو باتیں ان سے ہوئیں۔ اتنے میں جہاز نے روانگی کی سیٹی دے دی۔

جہاز کی روانگی کے بعد بہت دیر تک ساحل اور اس کے محبوب آثار کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد غسل کر کے کپڑے بدلے اور جہاز کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس کی ہر چیز سے طبیعت پہلے سے' جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' مانوس تھی اس وجہ سے کسی نئے ماحول سے مناسبت پیدا کرنے کا سوال نہیں تھا۔ وہی جانے پہچانے مسافر' وہی صورت آشنا افسر' وہی خدمت کرنے والے خانسامے اور بیرے اور وہی سرگرم اور مصروف خلاصی۔ غرض ہر چیز جانی بوجھی ہوئی۔ میں دو ڈھائی مہینوں کی دوادوش کی زندگی کے بعد جب شام کو کرسی بچھا کر برآمدے میں بیٹھا اور سمندر کی اچھلتی ہوئی موجوں پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ سفر کی ساری تکان دور ہو گئی۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ انسان کا نفس کتنا آرام پسند واقع ہوا ہے۔

بہت سے لوگوں سے جاتے ہوئے جہاز کے عرشے ہی پر ملاقات ہوئی تھی۔ اب پھر دو

ڈھائی مہینوں کی بعد اسی عرشے پر ملاقات ہوئی۔ ہر ایک نے اس دوران کی اپنی روداد سنائی اور ہماری روداد سنی۔ بعض کے متعلق یہ اطلاع بھی ملی کہ اسی دوران میں وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے۔ اکثروں کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس سخت سفر نے ان کی صحتوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ بعض لوگوں کی شکلیں اس قدر تبدیل ہو گئی تھیں کہ میرے لیے ان کا پہچاننا مشکل ہو گیا' حالانکہ ڈھائی ماہ پہلے اسی جہاز میں ان سے اچھا خاصا تعارف حاصل ہو چکا تھا۔

سردھانا کے روز و شب

جاتے ہوئے جہاز کے عرشے پر حاجیوں کے اندر جو دینی سرگرمیاں محسوس ہوتی تھیں واپسی میں وہ سرگرمیاں تو بہت کم ہو گئی تھیں تاہم نماز باجماعت کا اہتمام دوسرے ہی دن سے شروع ہو گیا۔

اس مرتبہ جہاز میں پینے کا پانی بڑا خراب تھا۔ اگرچہ مکہ معظمہ میں نمکین پانی پینے کے ہم کچھ عادی سے ہو گئے تھے مگر یہ پانی اس قدر بے مزہ تھا کہ اس نے میرے اس پر لطف سفر کا سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا۔

اب کے سردھانا کے میس کا انتظام بھی کچھ گڑبڑ ہی رہا۔ ناشتوں اور کھانوں کی ریل پیل تو وہی پہلے جیسی تھی' تنوعات میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن ہر چیز پھیکی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک روز تو میں ان کے مرغ دماہی سے اتنا بیزار ہوا کہ میں نے خشکہ اور دال کی فرمائش کی تاکہ کھانے کی بے مزگی کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔

اب کے دریا میں تلاطم بھی رہا اور گرمی بھی بڑی سخت رہی۔ تلاطم سے مجھے الحمدللہ کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ میں برابر صبح شام چہل قدمی بھی کرتا رہا' کھاتا پیتا بھی رہا اور برآمدے میں کرسی بچھا کر اس سفرنامے کے کچھ صفحات بھی لکھ لیتا۔ لیکن عام طور پر جہاز کے مسافر امتلاء اور درد سر میں مبتلا رہے۔ البتہ گرمی سے مجھے بھی بڑی سخت تکلیف رہی۔ کیبن کے اندر پنکھے کی ہوا ناکافی ہوتی تھی۔ اگرچہ کمروں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے

پلانٹ لگے ہوئے تھے اور میرا خیال ہے کہ درجہ اول کے مسافروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق بھی حاصل رہا ہو گا لیکن ہمارے جہاز کے منتظمین حاجیوں اور دوسرے مسافروں کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے میں پہلی ٹرپ میں ان سے جو بعض کوتاہیاں ہو گئی تھیں اس دوسری ٹرپ میں انھوں نے اس کی کسر نکال لی۔

عدن میں

اب کے ہمارے جہاز کو عدن سے پانی اور تیل لینا تھا اس وجہ سے سیدھے کراچی پہنچنے کے بجائے اس کو چند گھنٹوں کے لیے عدن میں ٹھہرنا پڑا۔ یہاں ہم رات میں پہنچے اس وجہ سے باہر کی دنیا کا کوئی اندازہ کرنا تو مشکل تھا لیکن میں نے جتنی تعداد میں اور جتنی قسموں کے جہاز یہاں لنگرانداز دیکھے اس سے پہلے کسی بندرگاہ میں نہیں دیکھے تھے۔ ہمارا جہاز جتنی دیر تک وہاں ٹھہرا رہا انگریز قوم کی ہوس استعمار کے خلاف میرے دل میں باربار نفرت کا جذبہ ابھرتا رہا۔

جب ہمارا جہاز ٹھہرا تو میں نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں چیزیں بیچنے والے جہاز کے نیچے آ گئے اور حاجی حضرات، جن کے پیٹ مکہ کی خرید و فروخت سے نہیں بھرے تھے، خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے۔ اس خرید وفروخت کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ مول بھاؤ طے کر لینے کے بعد بیچنے والے اپنا مال ایک ٹوکری میں رکھ کے اس کی رسی جہاز کے اوپر پھینک دیتے اور اوپر والے اس کو کھینچ لیتے۔ اسی طرح خریدنے والے اپنے پیسے ٹوکری میں رکھ کے اوپر سے کشتی میں لٹکا دیتے۔ یہ دلچسپ تجارت بڑی دیر تک ہوتی رہی اور میں نے دیکھا کہ اسی طرح خربوزے اور تربوز سے لے کر غالیچوں، اور قالینوں تک ہر چیز کی لوگوں نے خرید و فروخت کی۔

عدن کے بعد

عدن کے بعد گرمی تو موسمی ہواؤں کے چل جانے سے کچھ کم ہو گئی جس سے میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن دریا کا تلاطم کچھ زیادہ ہو گیا جس سے جہاز کی چہل پہل بالکل ختم ہو گئی۔ بالخصوص ڈک کے مسافروں کی نقل و حرکت تو بالکل ہی بند ہو گئی۔ مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ نماز باجماعت کا اہتمام اس کے باوجود بھی بعض دین داروں کی سرگرمی سے قائم رہا اگرچہ جہاز کی حرکت کا یہ عالم تھا کہ بسااوقات رکوع میں جاتے ہوئے آدمی بے تحاشا سجدے میں گر پڑتا تھا۔

قرب کراچی کی خوشی

یہ اعلان جہاز میں روزانہ ہو جاتا تھا کہ اب کراچی سے ہم اتنے دور رہ گئے ہیں اور یہ دوری جس رفتار سے کم ہوتی جا رہی تھی اسی رفتار سے لوگوں میں ایک چہل پہل بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ مگر میں نے لوگوں کی گفتگوؤں سے اندازہ کیا کہ عام طور پر لوگوں کے دلوں پر کراچی پہنچنے کی خوشی سے زیادہ کراچی کے کسٹم والوں کا ہول طاری ہے۔ جو شخص بھی بات شروع کرے سفر ختم ہونے اور وطن پہنچنے کی خوشی کا اظہار تو ایک دو فقروں میں کرے لیکن کسٹم والوں کی داروگیر، ان کی رشوت ستانیوں اور ان کی پیدا کردہ پریشانیوں کی ایک لمبی اور خوفناک داستان سنا ڈالے۔ میں لوگوں کی زبانی یہ داستانیں سنتا اور اس صورت حال پر افسوس کرتا رہا۔ میرے لیے اس صورت حال کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اتنے لمبے سفر سے لوٹنے والے یہ مسافر محض کسٹم کے خوف سے اب تک مراجعت وطن کی حقیقی خوشی سے محروم تھے۔ میں نے بعض لوگوں سے کہا کہ کسٹم والوں سے اس قدر کیوں گھبراتے ہو؟ جو سامان تمہارے پاس موجود ہیں ان کے سامنے رکھ دینا اور ان ے کہنا کہ قاعدے کی رو سے اس کا جو محصول بنتا ہے وہ لے لو۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ وہ مجھے اس کا یہ جواب دیتے کہ ابھی اس سے کچھ نہیں بنتا، اس کے باوجود بھی آدمی ان کسٹم والوں کے ہاتھوں بڑا پریشان ہوتا ہے۔

کسٹم کا ہول

بالآخر جہاز کراچی کے سمندر میں داخل ہو گیا اور یہ اعلان ہو گیا کہ جہاز اتنے بجے لنگرانداز ہو جائے گا۔ لوگوں نے اترنے کے لیے اپنے سامان ٹھیک ٹھاک کرنے شروع کر دیے' میرے لیے لوگوں کی اس تیاری کا سب سے زیادہ عجیب پہلو یہ تھا کہ بہتوں کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے ململ کے پورے پورے تھانوں کی پگڑیاں باندھ لی ہیں' بعضوں نے بیک وقت دو دو بلکہ تین تین قمیصیں اوپر نیچے پہن رکھی ہیں' بعض لوگوں نے دونوں ہاتھوں میں گھڑیاں باندھ رکھی ہیں' عورتوں نے بعض کپڑے بن سلے یا نیم سلے ہی پہن لیے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنے بچوں کو عربی لباس پہنا کر سر پر عقال باندھ دی ہے۔ یہ منظر جب میں نے دیکھا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ سارے لوگ کسی ورائٹی شو میں حصہ لینے کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ جب مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ یہ سب کچھ کسٹم کا ہول لوگوں سے کرا رہا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ یہ کسٹم بھی کیا مصیبت ہے جس نے اچھے خاصے سنجیدہ اور دیندار آدمیوں کو اس طرح کی ثقاہت سے گری ہوئی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

بندرگاہ کراچی

جب جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اسٹیمروں پر سوار اپنے اپنے حاجیوں کے استقبال کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ کم و بیش تین مہینوں کے بعد وطن کی سرزمین اور اہل وطن کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جہاز کا سفر کتنا ہی آرام دہ ہو لیکن جب سفر ختم ہوتا ہے اور آدمی کو وطن کے ساحل کی خشکی نظر آتی ہے تو اسے بے اندازہ خوشی ہوتی ہے۔ بلامبالغہ معلوم ہوتا ہے از سرنو زندگی حاصل ہوئی ہے۔

جب جہاز نے لنگر ڈال دیے تو حکیم صاحب نے مجھے یہ ہدایت کی کہ میں پہلے اتر جاؤں' وہ خود سامان اتروانے کے بعد اتریں گے۔ اتفاق کی بات کہ پاسپورٹ وغیرہ کے معائنے میں مجھے کوئی زحمت نہیں پیش آئی اور میں فوراً اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں

نے سفر میں واپسی کی دعا پہلی بار یہاں پڑھی اور کراچی کی زمین پر قدم رکھتے ہوئے جو خوشی ہوئی ہے وہ اس دوران کی چند بڑی خوشیوں میں سے ایک ہے۔

کسٹم کے احاطے میں

کسٹم کے احاطے میں جو کچھ پیش آنے والا تھا اس کا مجھے لوگوں کی باتوں سے ایک حد تک اندازہ تھا اس وجہ سے میں اس چیز کی طرف سے بالکل بے پروا ہو کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کے رہے گا' اس کی فکر کرنے سے کیا حاصل ہو گا۔ بیٹھتے ہی احاطے کی سلاخوں سے ایک طرف سلطان احمد صاحب اور دوسری طرف کراچی کے بعض دوسرے احباب نظر آئے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر دل کو مزید اطمینان ہو گیا کہ جو رسوائی یہاں ہونی ہے اس میں شریک ہونے والے اب بہت سے ہو گئے ہیں' سب مل کے بانٹ لیں گے۔

یہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں ہم بالکل ڈاکوؤں کے نرغے میں ہیں۔ جو شخص بھی آتا تھا وہ جاں بخشی کی شرط ایک متعین بھاری رقم بتاتا تھا۔ مجھ سے تو جس نے بات کرنی چاہی میں نے اس کو نہایت ترشی کے ساتھ جواب دیا لیکن ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا راستہ ایک ہی ہے' وہ یہ کہ دلالوں کو' افسروں کو اور پھاٹک کے پہرہ داروں کو رشوت دیجیے تب یہاں سے نکلیے' اس کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

بڑی دیر کے بعد ایک ثقہ اور سنجیدہ بزرگ آئے' انہوں نے مجھ سے سلام و مصافحہ کیا اور میرے بارے میں کسٹم کے ایک افسر سے کچھ بات کی اور چلے گئے۔ اس کے بعد اس نے میرے تمام سامانوں پر یکے بعد دیگرے ٹک مارک لگا دیے' رسمی طور پر بھی اس نے کچھ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس ہنگامہ قیامت کے دوران میں بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ میرا اندازہ ہے کہ ہزاروں روپے غریب حاجیوں کے جیبوں سے وصول کیے گئے ہوں

گے لیکن شاید ہی اس رقم میں سے ایک پیسہ حکومت کو ملا ہو۔ یہ ساری رقم بیچ کے آدمیوں نے کھالی۔ امید ہے کہ اب انقلابی حکومت نے ان حالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہو گی اور حجاج اس لوٹ اور اس ذلت و رسوائی سے محفوظ ہو گئے ہوں گے۔

کئی گھنٹے خراب ہونے کے بعد جب احاطے سے باہر نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس دروازے کے پہرہ داروں کو بھی کچھ نذر دینی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر یہ سامان باہر نہیں نکلنے دیتے۔ غرض ہر قدم پر ایک نئی مصیبت سے سابقہ تھا۔ خدا خدا کر کے کسی طرح اس دارالعذاب سے رہائی ہوئی اور باہر آ کر کراچی کے دوستوں سے ملاقات ہوئی تب جا کر ان تعاقب کرنے والوں کے اندیشے سے جان چھوٹی۔

پیر کالونی میں

یہاں سے برادرم شیخ سلطان احمد صاحب کے ساتھ ہم ان کے مکان واقع پیر کالونی پر آئے۔ اگرچہ یہاں پہنچ جانے کے بعد میرا ذہن سفر کے احساس سے بالکل آزاد ہو گیا لیکن معلوم نہیں کیوں یہاں پہنچتے ہی بچوں.... اور اماں کو دیکھنے کے لیے میرے دل میں بڑی بیتابی پیدا ہو گئی۔ اس پورے سفر میں الحمدللہ میرا ذہن بچوں اور گھر کے خیال سے بالکل فارغ رہا۔ اماں کو (اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے) ہم بستر مرض بلکہ بستر مرگ پر چھوڑ کر گئے تھے' مریم صدیقہ سلمہا کو بھی پہلی مرتبہ اتنے دنوں کے لیے ہم نے اپنے سے جدا کیا تھا' ننھے سلمان راشد کی پیاری پیاری حرکتیں بھی یاد آ سکتی تھیں لیکن کراچی پہنچنے تک میں ان ساری باتوں سے تقریباً خالی الذہن سا رہا لیکن کراچی پہنچتے ہی اس دنیا کی سب سے پہلی چیز جو میرے دل پر حملہ آور ہوئی وہ بچوں کی یاد تھی اور ساتھ ہی اماں کی بیماری کا خیال۔

میں نے سلطان احمد صاحب سے کراچی سے روانگی کا پروگرام معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ہماری سیٹ تو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بک کرا چھوڑی ہے لیکن ۳۶ گھنٹے کراچی میں قیام کے لیے بھی انہوں نے مخصوص کر لیے ہیں۔ سلطان صاحب کے بنائے

ہوئے اس پروگرام میں کسی تبدیلی کی گنجائش تو تھی نہیں' انہوں نے سارا پروگرام اپنی عادت کے مطابق اچھی طرح سوچ کر بنایا تھا لیکن کراچی میں یہ قیام ذرا دل پر شاق گزرا۔ اگرچہ یہ فوائد سے خالی نہیں رہا۔

ایک لطیفہ

پیر کالونی میں پہلی نماز میں نے مغرب کی پڑھی' یہاں مسجد میں ایک لطیفہ پیش آیا۔ مسجد سے نکلتے ہوئے جب میں نے اپنا جوتا دیکھا تو اس کو غائب پایا۔ اس پورے سفر میں ہم اپنی چیزوں کی طرف سے بہت بے پروا رہے تھے لیکن خدا کے فضل سے کہیں کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔ کراچی میں اترتے ہی جوتے کی چوری اور وہ بھی مسجد سے سچی بات یہ ہے کہ میرے لیے سخت شرمندگی کا باعث ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ چوری میں نے ہی کی ہے اور میری یہ چوری پکڑ بھی لی گئی ہے۔ سلطان صاحب نے جب مجھے شرمندہ کھڑے دیکھا تو وہ تاڑ گئے' جھپٹ کے آئے اور اپنی چپل میرے سامنے رکھ کر کچھ ایسے کلمات انہوں نے کہے جس سے میری کھسیاہٹ دور ہو۔ جوتے کا تو مجھے کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا' سلطان صاحب نے نیا جوتا خرید کر پہنا دیا' اگر کچھ افسوس ہوا بھی تو صرف اس پہلو سے ہوا کہ بڑے مبارک سفر میں یہ رفیق سفر رہا تھا' لیکن اس واقعہ کا خیال کر کے مجھے شرمندگی کا احساس باربار ہوتا رہا۔

اس واقعہ سے پہلے مجھے ان لوگوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی تھی جو اپنے جوتے نماز کے اوقات میں بڑی احتیاط سے اپنے آگے رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس کے بعد سے مجھے اس قسم کی احتیاطیں کرنے والوں کے ساتھ تھوڑی سی ہمدردی ہو گئی۔ اب میں خیال کرتا ہوں کہ نماز پڑھتے ہوئے بجائے اس کے کہ آدمی اپنے جوتے کی طرف سے اندیشوں میں مبتلا رہے یہ بہتر ہے کہ جوتے آگے رکھ لے تاکہ نماز اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ پڑھ سکے۔

کراچی سے لاہور

کراچی میں یہ ۳۶ گھنٹے گزار کے اور احباب سے مل ملا کے ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ریل میں جو رات میں نے گزاری اس میں شاید ایک منٹ بھی میں نہیں سویا۔ نہ سونے کی وجہ کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ شاید صرف اس خوشی کے سبب سے نیند نہیں آئی کہ کل صبح ہم خدا نے چاہا تو بچوں کو دیکھیں گے اور اماں کی قدم بوسی حاصل کریں گے۔ جب گاڑی لاہور چھاؤنی پر پہنچی تو نعمان میاں سلمہ نظر پڑے۔ یہ ملتان سے ہمارے ہی خیال سے سوار ہوئے تھے لیکن محض اس خیال سے ہم سے ملنے کی کوشش نہیں کی کہ ہم سو رہے ہوں گے۔ ان کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چند منٹوں میں گاڑی لاہور اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ہم نے سفر سے واپسی کی مسنون دعا پڑھی۔ بچوں کو دیکھا اور پیار کیا۔ جو مخلصین اسٹیشن پر آ گئے تھے ان سے سلام مصافحہ کیا۔

اس قسم کے کسی سفر سے واپسی کے موقع پر جو خوشی آدمی کو ہوا کرتی ہے اس کا تھوڑا بہت تجربہ ہر ایک کو ہو گا۔ میرے نزدیک تو اس خوشی کی یہ اہمیت ہے کہ مجردیہ ختم سفر کی خوشی ہی آدمی کے تمام مصائب سفر کا معاوضہ بن جاتی ہے' سفر کی دوسری برکتیں بس نفع ہی نفع ہیں۔

غالباً ۱۰ مئی ۱۹۵۸ء کی صبح کو ہم اس مبارک سفر پر روانہ ہوئے تھے اور ۱۴ اگست ۱۹۵۸ء کی صبح کو ہم بخیریت و سلامت گھر پہنچ گئے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین